بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کی تعلیماتِ امن و رواداری اور اس کی عصری معنویت
(تجزیاتی مطالعہ)

مقالہ نگار

رابعہ عزیز

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

نومبر، 2022ء

بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کی تعلیماتِ امن و رواداری اور اس کی عصری معنویت
(تجزیاتی مطالعہ)

مقالہ نگار

رابعہ عزیز

یہ مقالہ ایم فل علوم اسلامیہ کی جزوی تکمیل کے لئے پیش کیا گیا ہے۔

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

سیشن (2022ء-2019ء)

© رابعہ عزیز، 2022ء

بسم الله الرحمن الرحيم

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد ، فیکلٹی آف سوشل سائنسز

(Thesis and Defense Approval Form)

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالہ کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف سوشل سائنسز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالہ بعنوان: **بابا فرید اور مولانا روم کی تعلیماتِ امن ورواداری اور اس کی عصری معنویت: تجزیاتی مطالعہ**

Baba Farid and Maulana Rum Teachings of Peace and Tolerance and its Contemporary Effectiveness: An Analytical Study

نام ڈگری: ماسٹر آف فلاسفی علوم اسلامیہ

نام مقالہ نگار: رابعہ عزیز

رجسٹریشن نمبر: **Mphil/IS/F19 1695**

ڈاکٹر ریاض احمد سعید _____

(نگران مقالہ) دستخط نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی _____

(صدر، شعبہ اسلامی فکر و تہذیب) دستخط صدر، شعبہ اسلامی فکر و تہذیب

پروفیسر ڈاکٹر خالد سلطان _____

(ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز) دستخط ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز

بریگیڈیئر سید نادر علی _____

(ڈائریکٹر جنرل، نمل) دستخط ڈائریکٹر جنرل، نمل

تاریخ: _____

حلف نامہ فارم

(Candidate Declaration Form)

میں

رابعہ عزیز ولد

محمد عزیز

رجسٹریشن نمبر:1695 Mphil/IS/F19 رول نمبر: MP S19 505

طالبعلم، ایم فل، شعبہ اسلامی فکر و تہذیب ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز (نمل) اسلام آباد، حلفاً اقرار کرتی ہوں کہ

مقالہ بعنوان:

بابا فرید اور مولانا روم کی تعلیماتِ امن و رواداری اور اس کی عصری معنویت :تجزیاتی مطالعہ

Babā Farīd awr Maulānā Rūm kī T'alīmāt-i-Aman-o-Rawādāri awr uski Aṣrī Ma'anwīyat:Tajzīyātī M'uṭāli'a

ایم فل علوم اسلامیہ کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے سلسلہ میں پیش کیا ہے، اور ڈاکٹر ریاض احمد سعید کی نگرانی میں تحریر کیا ہے، راقم الحروف کا اصل کام ہے، اور یہ کہ مذکورہ کام نہ تو کہیں اور جمع کرایا گیا ہے، اور نہ ہی پہلے سے شائع شدہ ہے اور نہ ہی مستقبل میں کسی بھی ڈگری کے حصول کے لئے کسی دوسری یونیورسٹی یا ادارے میں میری طرف سے پیش کیا جائے گا۔

مقالہ نگار: رابعہ عزیز

دستخط مقالہ نگار: _____

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ملخص مقالہ(ABSTRACT)

Abstract

Baba Farid and Maulana Rum Teachings of Peace and Tolerance and its Contemporary Effectiveness: An Analytical Study

Islam is derived from Arabic word "سلامة" which means "Peace", so Islam is a religion of peace, harmony, tranquility, and patience. There is no space of oppression and violence in Islam. Many esteemed Muslim mystics always promoted peacefulness of Islam in the society by their modest characters, sincere efforts, humble services and attractive behavior. It was result of their countless efforts that establish peace in the society as well as in the entire world. Consequently, there is a great need in the current era to follow the characters of these esteemed mystics. In this research, the researcher will discuss an analytical study of Bābā Farīd and Mawlānā Rūmī teachings on peace and tolerance as well as its contemporary significance.

This study is divided into three chapters and every chapter has three sections. Chapter No.1 is about the introduction of Bābā Farīd and Mawlānā Rūmī and social milieu in that era, Chapter No. 2 discuss the meaning of peace and tolerance in Islam with its limitations and restrictions and analysis the impacts of Bābā Farīd and Mawlānā Rūmī teachings on peace and tolerance and last Chapter spread lights on Contemporary implications about teachings of Bābā Farīd and Mawlānā Rūmī.

The conclusion of thesis can be summarized as follows; in modern era, materialism is spread everywhere, and the society has suffered from different issues such as sectarianism, violence and hypocrisy. So, the teachings of harmony, peace and patience need to be spread around the world to make this world a better place. In this context, we should also examine our role, how far we have strayed from the true teachings of Islam. It is necessity of time, that we also feed the hungry by adopting the life of the ṣūfiyyah. Become a feeder for hungry people to create a society based on love.

Keywords: Contemporary Effectiveness, Maulana Rum, Baba Farid, Teachings of peace, Tolerance, Mystics, spread of Islam.

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
1	مقالہ کی منظوری کا فارم (Thesis and Defense Approval Form)	i
2	حلف نامہ (Declaration)	ii
3	ملخص مقالہ (Abstract)	iii
4	فہرست عنوانات (Table of Contents)	iv
5	اظہارِ تشکر (Acknowledgments)	vi
6	انتساب (Dedication)	vii
7	مقدمہ	1
8	باب اول : بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ: شخصیت تعلیمات اور حالاتِ زندگی	19
9	فصل اول: بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کا تعارف	20
10	فصل دوم: بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کے دور کا ماحول	30
11	باب دوم: اسلام میں رواداری کے اصول و آداب اور اہمیت	41
12	فصل اول: اسلام میں امن اور رواداری کا مفہوم اور ضرورت و اہمیت	44
13	فصل دوم: نبی ﷺ کے غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات اور رواداری	58
14	فصل سوم: اسلام میں رواداری کے اصول و آداب	76

15	باب سوم: بابا فرید اور مولانا روم کے افکار کا تجزیاتی مطالعہ	92
16	فصل اول: بابا فریدؒ کی تعلیماتِ امن و رواداری	94
17	فصل دوم: مولانا رومؒ کی تعلیماتِ امن و رواداری	99
18	فصل سوم: بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کی تعلیماتِ امن و رواداری کے اثرات	103
19	باب چہارم: بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کی تعلیماتِ کی عصری معنویت	114
20	فصل اول: بابا فریدؒ کی تعلیماتِ امن و رواداری کی عصری اہمیت	115
21	فصل دوم: مولانا رومؒ کی تعلیماتِ امن و رواداری کی عصری اہمیت	127
22	فصل سوم: بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کی تعلیمات کا تقابل	135
23	خلاصہ بحث	145
24	نتائج	147
25	سفارشات	148
26	فہارس	149
27	مصادر و مراجع	155

اظہارِ تشکر (Acknowledgments)

صد لاکھ شکر اس ذات کا کہ جس نے مجھے یہ زندگی بخشی اور مجھ ناچیز کو اتنی ہمت واستطاعت عطافرمائی کہ میں نے یہ کام مکمل کر لیا اور پھر اُس ذات پاک کا کہ جس کے اسوہ حسنہ نے زندگی جینے کے اسلوب سکھائے اور اسلام جیسا دین عطا کیا گیا۔

خصوصا جن کے بغیر میری یہ تحقیق مکمل نہ ہو پاتی اگر مجھے ڈاکٹر ریاض احمد سعید کی راہنمائی میسر نہ آتی، آپ کے لیے شکر گزاری کا جذبہ ہمیشہ قائم رہے گا جس طرح آپ نے گوناگوں مصروفیات سے گراں قدر وقت نکال کر میری راہنمائی کی اور مشکلات کو حل کرنے کے ساتھ ساتھ میری حوصلہ افزائی بھی کی۔

اس کے علاوہ میں اپنی یونیورسٹی کے تمام اساتذہ کرام کی شکر گزار ہوں کہ جن کی وجہ سے مجھے بھی بہت کچھ سیکھنے کا نادر موقعہ ملا، بالخصوص میں واجب الاحترام صدر شُعبہ علومِ اسلامیہ جناب پروفیسر ڈاکٹر مستفیض علوی اور قابل احترام ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز جناب پروفیسر ڈاکٹر خالد سلطان کی دلی شکر گزار ہوں۔

میں اپنے والدین کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جن کی بے لوث محبت اور حوصلہ افزائی سے ان گنت آندھیوں وطوفانوں میں بھی یہ شمعِ علم روشن رہی اور جن کی دعاؤں کی بدولت میرا یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اور ان تمام صاحبان کی بھی ممنونِ احسان ہوں جو میری اس تحقیق میں معاون بنے، خصوصی طور پر محمد ایاز کی غیر معمولی معاونت کی مقروض ہوں۔

آخر میں اللہ پاک سے دعا ہے کہ اللہ پاک سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے اور دنیا آخرت کی سعادت نصیب فرمائے۔ آمین۔

انتساب(Dedication)

میں اپنی اس کاوش کا انتساب اللہ تعالی کا شکر ادا کرتے ہوئے خاتم النبیین ﷺ کے نام کرتی ہوں جو سارے جہان کے لیے سراپا رحمت ہیں۔

اس کے ساتھ ہی اس کوشش کو اپنے شفیق اساتذہ کرام، محترم والدین اوراپنی زندگی کے ساتھی محمد ایاز کے نام کرتی ہوں، جنہوں نے زندگی کے ہر موڑ پر میری راہنمائی اور مجھ سے تعاون کیا۔

مقدمہ

موضوعِ تحقیق کا تعارف(Introduction of the Topic)

اس دنیا میں ازل سے لے کر آج تک اور رہتی دنیا تک ہر آنے والا انسان کی ایک ہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اپنی زندگی اور اس سے وابستہ لوگوں کی زندگی کے تمام معاملات سکون و اطمینان سے گزر جائیں چاہے وہ کسی بھی مذہب یا عقیدہ سے تعلق رکھتا ہو لیکن اس کے دل میں یہی جذبہ سر شار ہوتا ہے۔ باالفاظ دیگر امن و اماں اور بقاو تحفظ انسان کی بنیادی ضرورت اور فطری تقاضا بھی ہے۔ کسی بھی مذہب یا عقیدے سے تعلق رکھنے والے لوگ عدم تحفظ میں زندگی نہیں گزار سکتے اور پر سکون زندگی گزارنے کے لیے سب سے اہم چیز ہماری بنیادی ضروریات جیسا کہ بھوک، پیاس، جان و مال کا تحفظ، کی تکمیل ہے۔

سائیکالوجی کے مشہور سکالر ''ابرہام ماسلو'' کے مطابق:

> ''Fundamental to humanistic thinking was Abraham H. Maslow's[1] idea of a hierarchy of needs. This notion first sketched out in 1943, Abraham H. Maslow worked on the assumption that humans have an innate tendency to grow into happy, moral people, ail they need are the right conditions. To explain such activities Maslow proposed the idea of growth motivation. However, he claimed that it is only when deficiency needs have been met that growth needs begin co emerge. The implications of this are clear. If we want people to grow into happy, moral and fulfilled adults we must ensure that their basic deficiency needs such as hunger, thirst, sex, security, belonging and esteem are met. Only, then will they spontaneously manifest the motivation to actualize their full potential.''[2]

''اگر ہم چاہتے ہیں کہ لوگ خوش اخلاق اور ہنسی خوشی زندگی بسر کریں تو ہمیں اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ لوگوں کی بنیادی ضروریات جیسے کہ بھوک، پیاس، جان و مال کا تحفظ،

[1] Abraham Harold Maslow (1908-1970). Maslow served as the chair of the psychology department at Brandeis from 1951 to 1969. While there he met Kurt Goldstein, who had originated the idea of self-actualization in his famous book; The Organism (1934). It was also here that he began his crusade for a humanistic psychology, something ultimately much more important to him than his own theorizing. See for more details: https://webspace.ship.edu/cgboer/maslow.html

[2] Connolly, Peter, *Approaches to the Study of Religion* (London: The Continuum International Publishing Group, 1999), 135-192.

دوسروں سے اچھے تعلق کو پورا کیا جائے۔ بنیادی ضروریات کے اس انسانی خیال کا تصور پہلی بار 1943 میں منظر عام پر آیا تھا، ابرہام مسلو نے اس مفروضے پر کام کیا کہ انسانوں میں خوش اخلاق انسان بننے کا ایک فطری رجحان ہوتا ہے، لیکن انہیں صحیح حالات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب لوگوں کی بنیادی ضروریات پوری ہو جائیں گی تو صرف، تب ہی وہ اپنی پوری صلاحیت کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوششیں کریں گے۔''

تو اس فطری ضرورت کو پورا کرنے کے لیے دنیا کا ہر مذہب اپنے پیروکاروں کو مختلف طریقوں سے راہنمائی فراہم کرتا ہے مختلف مذاہب کی اہم شخصیات کی تعلیمات کی طرف نگاہ دوڑائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر کوئی انسانیت کے احترام و تحفظ کا ضامن ہے۔

انسانیت کے تمام بڑے مذاہب نے ہمیشہ لوگوں کو پر سکون اور عالمگیر بھائی چارے کی تلقین کی ہے۔ جیسا کہ ''اہنسا'' یا عدم تشدد تقریباً تمام آریائی مذاہب جیسے ہندومت کا بنیادی اصول ہے، بدھ مت اور جین مت؛ سامی مذاہب جس میں یہودیت، عیسائیت اور اسلام شامل ہیں، یہ سامی مذاہب توحید، انبیاء اور موت کے بعد کی زندگی؛ بین المذاہب اور بین المذاہب کے درمیان امن اور مفاہمت پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔[1]

لیکن سامی ادیان میں صرف دین اسلام ہی ہے جو کہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اسلام نے ہر طرح سے انسانوں کے حقوق مقرر کیے ہیں یہاں تک کہ اسلام نے جانوروں اور پرندوں کو بھی حقوق دیے ہیں کہ ان کے ساتھ بھی کسی قسم کی ناانصافی اور ظلم نہ کیا جائے۔ تو انسان تو اشرف المخلوقات ہے جو کہ جنوں اور جانوروں سے بہتر ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مذہبِ اسلام تو حرمتِ نفس اور احترامِ انسانیت کا داعی بھی ہے۔ اسلام نے ہر دور میں انسانیت کی تحفظ اور بقا کا ذمہ لیا ہے۔ قرآن و احادیث سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ میدانِ جنگ میں بھی ہمدردی اور رحم دلی کا مظاہرہ کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ جب بھی کسی کو قائد بنا کر جنگ کے لئے بھیجتے تو اس کو یہ نصیحت فرماتے:

[1] Anjum, Muhammad Rafique, "Concept of Peace in World's Major Religions: An Analysis", *International Journal of Scientific and Research Publications*, 7:4, (2017), 248.

((في رواية أبي داود: ولا تقتُلوا شَيخًا فانيًا ولا طِفلًا ولا صَغيرًا ولا امرأةً[1]))

جنگ میں بڑی عمر کے بزرگ، چھوٹے بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کیا جائے۔

اور یہ صرف اسلام ہی کا طرہءِ امتیاز ہو سکتا ہے کہ جنگ و امن میں لوگوں سے حسن سلوک کیا جائے۔

اسلام کے درخشندہ ستاروں نے دین اسلام پر ﴿ادخلوا فی السلم کافة﴾ کے مصداق مکمل طور پر دین اسلام کا حق ادا کیا۔ انہی روشن ستاروں میں سے بابا فرید گنج شکر اور مولانا رومی بہت اہمیت کے حامل تھے۔ کیونکہ وہ دین اسلام کی تبلیغ بھی اس طریقے سے کرتے تھے کہ غیر مسلم ان کے رویے اور طرز عمل سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے وہ عام انسان کی مدد کرنا اور اس کی زندگی سنوارنا اور اس زندگی کو شعور کے ذریعے بہتر بنانا چاہتے تھے، خاص طور پر اخلاقی و روحانی نظریہ سے وہ اس معاملے میں کسی جبر یا زبردستی سے کام لینے کی اجازت نہ دیتے تھے۔

بابا فرید گنج شکر نے تصوف کے اسرار و رموز پہچاننے کے بعد لوگوں کو یہ سکھایا تھا کہ سچائی تک صرف وہ انسان پہنچتے ہیں جو سچے دل سے اس تک پہنچنے کی تگ و دو کرتے ہیں اور جو انسانوں سے محبت کرتے ہیں۔ ان کے کام آتے ہیں اور ان کے دکھ درد کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بابا فرید لوگوں کے دکھ درد سے منہ موڑ کر جنگل میں جا کر عبادت کرنے کو اہمیت نہیں دیتے تھے ان کی زندگی اللہ تعالیٰ کے لیے وقف تھی۔ تاعمر خدا کی بندگی میں مصروف رہے لیکن ساتھ ہی ساتھ انسانوں سے بابا فرید کو گہرا لگاؤ اور محبت تھی۔

بابا فرید گنج شکر کا زہد خدا کی ہستی کے حقیقی پر جوش اقرارِ صالح سے منسلک ہے۔ ان کے لبوں پر ہمیشہ یہ الفاظ رہتے تھے ''میں تیرے لیے جیتا اور تیرے لیے مرتا ہوں۔ بابا فرید نے اپنے اشعار میں اعتدال پسندی، رواداری اور انسان دوستی کا پیغام دیا ہے۔ اور تعصب، تنگ نظری اور گروہ پرستی جیسے عناصر کو ناپسند کیا ہے۔

اسی درخشندہ سلسلے میں مولانا جلال الدین رومی بھی شامل تھے۔ وہ ہر مسلمان کو قرآنِ حکیم کے مطابق ''**صبغة اللہ**'' کے رنگ میں رنگے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ عشق کی دعوت دیتے تھے جس کا تعلق اس عالم سے نہیں بلکہ اس کا تعلق اللہ تعالی کی ذات سے ہے۔ وہ عشق حقیقی ہے جو اس راستے پر چلتا ہے وہ امن، محبت و بھائی چارے کا درس دیتا ہے۔

---

[1] السجستاني، ابوداؤد سلمان بن الاشعث، **السنن**، كتاب الجهاد، (رياض: دار السلام للنشر والتوزيع، 1999ء) ح138۔

مولانا کی حکمت و امن پسندانہ روش کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے، ''ایک دفعہ راستے میں دو آدمی لڑائی جھگڑا کر رہے تھے ان میں سے ایک نے کہا اگر تو ایک کہے گا تو مجھ سے دس سنے گا اتفاق سے مولانا کا ادھر سے گزر ہوا آپ نے اس شخص سے فرمایا: ''بھائی جو کچھ کہنا ہے مجھ سے کہو، اگر تم ہزار کہو گے تو ایک بھی نہ سنو گے'' وہ دونوں آدمی مولانا کے پاؤں میں گر پڑے اور آپس میں صلح کر لی۔

بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کی تعلیمات کا اہم نقطہ امن و محبت، بھائی چارے اور رحم دلی کا درس نمایاں کرتا ہے ان کے نزدیک باہمی اتفاق سے رہنا امن کا باعث ہے اور یہی اسلام کی تعلیمات کا اہم نقطہ ہے۔

موضوعِ تحقیق کی ضرورت واہمیت:(Importance of the Topic)

حصولِ امن اس وقت دنیا کا اہم مسئلہ بن چکا ہے اور دنیا کے صفِ اول کے مفکرین و محققین اس مسئلے کے حل کے لیے اپنے تفکر پیش کر رہے ہیں۔اس مسئلہ کے پیشِ نظر چند اہم شخصیات (بابا فرید الدین مسعود گنج شکر، مولانا جلال الدین رومی) کی تعلیماتِ امن و رواداری قابل ذکر ہیں۔اس تحقیق سے مختلف مذاہب کے لوگوں کو بھی شعور اور آگاہی ملے گی کہ اسلام دہشت گرد عناصر کی حوصلہ شکنی کرتا ہے اور ایک امن پسندانہ اور باہمی اتفاق و بھائی چارے کے معاشرے کا پرچار کرتا ہے اسلام کے سنہری اصولوں پر عمل پیرا ہو کر اس دنیا کو ایک امن پسند جگہ بنا سکتے ہیں

بابا فرید الدین گنج شکرؒ، مولانا جلال الدین رومیؒ نے زندگی بھر محبت و بھائی چارے کا درس دیا اور مخلوق سے محبت کر کے خالق تک رسائی حاصل کرنے کے طریقے سے سب کو روشناس کروایا معاشرے میں امن کی فضا قائم کی اور یہ مساوات اور بھائی چارے کو عام کرنے، تعصب اور مذہبی گروہ بندیوں کو ختم کرنے میں معاون ثابت ہوئی۔

بابا فریدؒ بارہویں صدی کے صوفی شاعر تھے اور انہیں پنجابی ادب اور شاعری کی بنیاد مانا جاتا ہے آپ کی شاعری میں بھائی چارے، امن و سلامتی، مساوات اور انسانیت کا درس ملتا ہے۔آپ نے ہمیشہ دین کی ترویج کی خاطر پیار، محبت اور امن کا درس دیا۔ایک بار بابا فرید کو کسی نے قینچی نذر کی بابا فرید نے جواب دیا مجھے سوئی دیجیے کیونکہ میں سیتا ہوں کاٹتا نہیں۔لوگوں کو ایک دوسرے کے عقائد کو بہتر افہام کے ذریعے قریب لانا چاہتے تھے۔ایک مذہب کی دوسرے مذہب پر برتری اور فوقیت ثابت کر کے آپس میں پھوٹ پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔

فرید! جے تیں مارن مکیاں، تنہاں نہ ماریں گھم آپنڑے گھر جایئے، پیر تنہاں دے چم[1]

(اے فریدؒ! جو تجھے زور کوب کرنا چاہتے ہیں یعنی جو تجھے تکلیف دینا چاہتے ہیں، تو ان سے انتقام نہ لے بلکہ ان کے درِ دولت پر جا کر ان کی قدم بوسی کر یہ حلم وانکساری کی انتہا ہے)

مولانا جلال الدین رومی کی تعلیمات سے انسانیت کو تحفظ ملا اور غلامی سے نجات دلائی۔ انسانیت میں احترام نفس پیدا کیا۔ مساوات، بھائی چارہ اور امن کا پیغام دیا مولانا کی مثنوی معنوی کے چھ دفاتر (چھ جلدوں) میں اول سے آخر تک قرآنی آیات تلمیح، اشارہ یا کنایہ کے صورت میں مختلف اشعار میں ملتی ہیں جس میں امن و رواداری کا درس ملتا ہے۔

دست کو رانہ بہ حبلاللہ زن جز برامر و نہی یزدانی متن[2]

(اندھا دھند اللہ کی رسی پر ہاتھ ڈال، خدائی امر و نہی کے سوا ارادہ نہ کر)۔

وجہِ تحقیق:(Rationale of the Study)

کسی بھی ذی روح نسل کی بقا کے لیے امن بھی ایک لازمی جزو ہے، امن کو قائم رکھنے کی ذمہ داری نسلِ انسانی کے سپرد کی گئی۔ ازل سے نسلِ انسانی کو درپیش مسائل میں سے ایک بڑا مسئلہ امن کا حصول بھی رہا۔ اس مسئلے کے حل کے لیے سب سے بہترین جواز ہر دور کی ہر مذہب کی تعلیمات نے پیش کیا۔ دورِ حاضر میں بھی نسلِ انسانی اس سنگین نوعیت کے مسئلے سے دوچار ہے۔ بطورِ طالبِ علم میری سوچ و فکر کا رخ اس مسئلے کے حل کا بہترین جواز ڈھونڈنے میں رہا۔ چونکہ ایم فل علومِ اسلامیہ کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے ایک مقالہ لکھنا تھا، میری دلچسپی کا 'موضوع تعلیماتِ امن از مذہبِ اسلام' تھا لیکن جب میں نے جائزہ لیا تو اس موضوع پر ان گنت تحقیقات ہو چکی تھیں اور ان میں سے کوئی خلاء ڈھونڈنا ایک مشکل ترین کام تھا۔ جب میں نے صوفیا کے ہاں اس موضوع کو تلاش کیا تو مجھے چند ایک تحقیقات ملیں، خاص کر بارہویں اور تیرہویں صدی کے بڑے صوفیا کرام کی تعلیماتِ امن پر کوئی تسلی بخش کام نہ ملا۔ یوں میری تحقیق کا موضوع وجہ انتخاب بنا کہ اس دور کے بڑے صوفیا کرام کی تعلیماتِ امن کو عصری معنویت کی رو سے پیش کیا جائے۔

---

[1] The Sri Guru Granth Sahib in Gurmukhi & Shahmukhi, (S. Gurbachan Singh Bedi) , Ottowa, Canada, 5881

[2] رومی، جلال الدین، **مثنوی معنوی** (رنیولد الین نیکلسون، س ن)، 1085۔

موضوعِ تحقیق پر سابقہ کام کا جائزہ:(Literature Review)

پوری کوشش اور محنت سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اس موضوع پر اس طرح کا کوئی عملی کام نہیں ہوا، جس میں بابا فرید مسعود گنج شکر، مولانا جلال الدین رومی کی تعلیماتِ امن و رواداری کا جائزہ لیا گیا ہو۔ لیکن اس سے متعلق ملتے جلتے کچھ عنوانات پر مختلف نوعیت کا کام ہوا ہے جو کہ درج ذیل ہے۔

Harendrachandra Paul, "*JALĀLU'D-DĪN RŪMĪ AND HIS TAṢAWWUF*" (PhD diss., University of Calcutta, 1985)

یہ مقالہ مولانا جلال الدین رومی پر لکھے گئے مقالوں میں سے سب سے اہم ہے کیونکہ اس کو لکھنے والا ایک مسلمان نہیں تھا۔ مصنف نے اس مقالے میں مولانا جلال الدین رومیؒ کی زندگی کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے اور تصوف کے بارے میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ مزید اُن کے بارے میں بیان کرتے ہوئے اُن کے فلسفے اور تصوف کو بیان کیا گیا ہے جس میں انہوں نے مذہب سائنس اور فلسفے کا ذکر کیا اور اسلام کو صوفیانہ طرز میں لکھا گیا ہے اور مولانا رومؒ کے تصورات کو بیان کیا گیا ہے۔

محمد اسلم ،"قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کے غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات "(مقالہ برائے پی- ایچ ڈی پنجاب یونیورسٹی لاہور، 2002)

اس مقالے میں قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے غیر مسلموں سے تعلقات معاہدات نبوی ﷺ کی روشنی میں تفصیلاً بیان ہوئے ہیں۔ دورِ رسالت سے لے کر تابعین کے سنہری دور تک جس طرح مسلمانوں نے غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کیے اُن کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ غیر مسلموں سے ہونے والے معاملات و معاہدات سے معاشرہ امن و آشتی کا گہوارہ بن گیا اور نسل در نسل مسلمانوں اور غیر مسلموں میں یہ معاملات و معاہدات چلتے رہے۔

محمد شارق ،"بین المذہب رواداری ،اسلوب اور دائرہ کار(قرآن اور سیرت طیبہ کی روشنی میں)"، (مقالہ برائے ایم۔فل، وفاقی اُردو یونیورسٹی، کراچی، 2007)۔

اس مقالہ میں قرآن اور احادیث مبارکہ کے ذریعے دوسرے مذاہب کے ساتھ رویے اور تعلقات کو بیان کیا گیا ہے۔ جو دائرہ کار ہمیں قرآن اور احادیثِ مبارکہ میں بتایا گیا ہے، اُس کی وضاحت کی گئی ہے دوسروں کے ساتھ

معاملات میں آسانی ہو۔اس مقالے میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ کہ کس حد ہمیں غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات رکھنے چاہیے اور کن حدود و قیود میں رہ کر کرنے چاہیے۔

عزیزالرحمان عزیز، ''علامہ اقبال اور مولانا روم کے تصور فقر کا تقابلی جائزہ،''(مقالہ برائے ایم۔فل علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،2008)

مظفر علی کشمیری، ''مولانا روم اور علامہ اقبال کی قرآن فہمی کا تجزیاتی مطالعہ، مثنوی معنوی اور اردو کلام اقبال کے تناظر میں''،(مقالہ برائے ایم فل علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،2013)

اس مقالے میں مولانا روم کی مشہور زمانہ 'مثنوی مولانا روم' کو معنوی انداز میں بیان کیا گیا ہے اور ساتھ ہی علامہ اقبال کے اُردو کلام میں سے اُن اشعار کو منتخب کیا گیا ہے جو قرآن مجید کی آیات سے مماثلت رکھتے ہیں ان دونوں شخصیات نے اپنے اندازِ فکر اور اپنے اندازِ بیان سے اپنے اپنے اشعار کو بیان کیا ہے۔

اس مقالے میں مولانا روم اور اقبال کے تصورِ فقر کو بیان کرتے ہوئے اس کا تقابلی جائزہ کیا گیا ہے۔دونوں اہل علم کے ہاں لفظی معانی میں فرق ہونے کے باوجود اصل روحِ فلسفہ ایک دوسرے سے مطابقت رکھتی ہیں۔

حافظ محمد طارق، ''رواداری کا اسلامی تصور سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں''، (مقالہ برائے پی۔ایچ ڈی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور 2017)

اس مقالے میں رواداری کے اسلامی تصور کو نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے جس کی مدد سے ہم معاشرے میں اُن افراد کے ساتھ معاملات کر سکتے ہیں جو غیر مسلم ہیں جس طرح نبی اکرم ﷺ نے غیر مسلموں کو بھی اپنی مجلس اور مسجد میں جگہ دی تاکہ وہ لوگ آئیں اسلام کی باتیں سنیں اور دائرہ اسلام میں داخل ہوں۔ نبی اکرم ﷺ نے ایک دائرہ کار مقرر کر کے اس کے اندر رہتے ہوئے دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ معاشی و معاشرتی تعلقات رکھے۔

محمد فاروق، ''رواداری کا اسلامی تصور سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں''،(مقالہ برائے پی-ایچ ڈی گرثیرن یونیورسٹی لاہور،2018)

اس مقالہ میں رواداری کے معانی و مفہوم کے ساتھ ساتھ رواداری کا جو تصور نبی کریم ﷺ نے پیش کیا تھا اس کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں جو برتاؤ اور سلوک غیر مسلموں اور کفار کے ساتھ روا رکھنا چاہیے اس دورِ حاضر کے تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔

سیدہ سعدیہ، ''قیام امن اور حیات نبوی ﷺ''، (مقالہ برائے پی-ایچ ڈی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 2017)

اس مقالے میں امن کی تعریف کو بیان کیا گیا ہے۔ جو نبی اکرم ﷺ نے اپنا کہ میں قیام امن کو فروغ دیا اور نیز اُن اقدامات کو ذکر کیا گیا ہے جو نبی کریم ﷺ نے امن کے قیام کے لیے اُٹھائے۔ اُن میں سے کچھ مدینہ کی حدود کے اندر کے لیے تھی اور کچھ اقدامات مدینہ کی حدود سے باہر کے لیے تھی۔ اُن اقدامات کی وجہ سے امن کو قائم کر کے نبی کریم ﷺ نے اسلام کی تبلیغ کو پُر امن طریقے سے لوگوں میں عام کیں۔

اردو کتب

مثنوی معنوی

اس کتاب کے مصنف مولانا جلال الدین رومی ہیں اس کتاب کے چھے دفتر ہیں۔ یہ کتاب حکایاتِ رومی سے بھرپور ہے۔ مولانا روم نے اس میں مختلف طریقوں اور انداز سے سبق آموز حکایات بیان کی ہیں۔

بابا فرید گنج شکر حیات اور کارنامے

اس کتاب کے مصنف گربچن سنگھ ہیں. اس کتاب میں بابا فرید کی پیدائش پہلے کا ماحول اور پھر ان کی حیات تک کے کارناموں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

سوانح مولانا روم

اس کتاب کے مصنف سید اصغر حسین نے اس کتاب میں نہ صرف مثنوی معنوی کے کچھ حصے کو بیان کیا ہے بلکہ مولانا کے حالات و واقعات کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

افکار رومی

اس کتاب کے مصنف محمد عبدالسلام نے مولانا رومی کے افکار اور حالات کو تفصیل سے بیان کیا ہے. مثنوی میں جن حکایات کے موضوع ہیں ان میں سے چند کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

حالات واقعات شان حضرت بابا فرید گنج شکر

اس کتاب کے مصنف عالم فقیری ہیں اس کتاب میں انہوں نے بابا فرید کے حالات وواقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور ساتھ وہ وظائف بھی بیان کیے ہیں جو بابا فرید اپنے مریدوں کو بتایا کرتے تھے۔

ریسرچ پیپر

Manzoor, Seema, Nasreen Aslam Shah, and Asma Manzoor, "SUFISM AS A GLOBAL HIGHWAY TO PEACE". *Iḥyāʾal ʿulūm - Journal of Department of Quran O Sunnah* 19 (2020).

اس آرٹیکل میں صوفیا کرام نے امن کے نفاذ کے لیے جو کام کیا اس کو بیان کیا گیا ہے۔ اہل تصوف نے اسلام کے امن کے پیغام کو دنیا کو پوری دنیا میں پھیلایا اور مزید اس میں اسلام میں تزکیہ نفس کے تصور کو بیان کیا گیا ہے اور اس کے علاوہ امن کے قیام کی بنیادوں پر بھی تفصیل بیان کی گئی ہیں۔

Elena Furlanetto, The 'Rumi phenomenon' between orientalism and cosmopolitanism, The case of Elif Shafak's The Forty Rules of Love, *European Journal of English Studies*, Vol 17, Aug 2013

اس آرٹیکل کی مصنفہ کے مطابق دور معاصر میں مولانا رومی کی شاعری کو امریکا میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ یہ آرٹیکل بہت اہم ہے کیونکہ اس میں مولانا روم کی زندگی کو امریکیوں کے لیے دیکھا یا گیا ہے۔ مولانا روم جنہوں نے شاعری سے امن و سلامتی اور محبت کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور اس پر عمل کر کے ہم اس دنیا کو امن و سلامتی کا گہوارہ بنا سکتے ہیں

Alina Beatrice Chesca, History, Culture Peace: Rumi Mevlana, The 11th Edition of International Conference European Integration Realities and Perspectives, 2016.

یہ آرٹیکل ایک کانفرنس میں پڑھا گیا تھا جس کو بعد میں شائع کیا گیا، اس میں مولانا روم کی تعلیمات پر بحث کی گئی ہے۔ مولانا روم جو امن و محبت کے داعی بن کر آئے، جس طرح کے حالات میں انہوں نے پرورش پائی وہ نہایت پرآشوب دور تھا اور اس طرح کے حالات میں مولانا روم کی شاعری جس میں محبت اور امن کا پیغام ہے جو اس آرٹیکل میں بیان کردہ تعلیمات ہیں نہایت مؤثر ثابت ہوئی ہیں۔

Nevad Katheran, Rumi's Philosophy of Love in the Era of U-turned Islam ،*Kyoto Bulletin of Islamic Area Studies*, 2, March 2009.

یونیسکو نے 2007 کے سال کو مولانا رومی کے سال کے طور پر منایا تھا، جس کا بنیادی مقصد مشرق اور مغرب کے درمیان خلا کو پر کرنے تھا اس خلا کو مولانا رومی کی امن و محبت کی شاعری اور بھائی چارہ کے فلسفے سے پر کیا جا

سکتا ہے جو انہوں نے اپنے اشعار میں واضح کیا ہے۔ اسلام میں جو امن و محبت کو اہمیت دی گئی ہے مولانا روم نے اپنے فلسفے سے لوگوں کو اس میں عام کیا ہے

تحقیقی خلاء:(Research Gap)

درج بالا مقالہ جات میں جس نوعیت کا کام ہوا ہے اس میں زیادہ تر تصوف، عشق حقیقی اور فقر کے متنوع پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے لیکن میرے مقالے کے کام کی نوعیت کچھ مختلف ہے میرے عنوان کے تحت بابا فرید اور مولانا روم کی تعلیمات میں سے اس حصے کو زیرِ بحث لایا گیا ہے جس میں امن و رواداری کی تعلیمات ہیں میرے مقالے کا بنیادی مقصد مذکورہ شخصیات کی تعلیماتِ امن و رواداری کی روشنی میں اسلام کی اشاعت اور انسانیت سے محبت کا درس دینا ہے ضرورت اس امر کی ہے ان شخصیات کی تعلیمات پر عمل کر کے دنیا کے سامنے اسلام کی حقانیت کو پیش کرنا ہے۔

موضوعِ تحقیق کے مقاصد: (Objectives of the Study)

1. اسلام میں باہمی رواداری کے اصول و آداب کی کھوج لگانا۔
2. بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کی تعلیمات سے سماجی امن اور باہمی رواداری سے متعلق تصورات کا تجزیہ کرنا۔
3. بابا فریدؒ اور مولانا روم کی تعلیمات برائے سماجی امن اور باہمی رواداری سے استفادہ کرنا۔

موضوعِ تحقیق سے متعلق بنیادی سوالات: (Research Questions)

1. اسلام میں باہمی رواداری کے اصول و آداب کیا ہیں؟
2. بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کے سماجی امن اور باہمی رواداری سے متعلق کیا تصورات ہیں؟
3. عصرِ حاضر میں بابا فریدؒ اور مولانا روم کی تعلیمات برائے سماجی امن اور باہمی رواداری سے کیسے استفادہ کیا جا سکتا ہے؟

تجدیدِ موضوع:(Limitation & Delimitations)

یہ تحقیق، اسلام میں رواداری کی حدود و قیود کو بیان کرتے ہوئے بابا فرید الدین گنج شکرؒ اور مولانا جلال الدین رومیؒ کی تعلیماتِ امن و رواداری کی نشاندہی کرتی ہے اور عصری تناظر میں اس سے استفادہ کرنے تک محدود ہے۔

منہجِ تحقیق :(Research Methodology)

1. اس تحقیق کا بنیادی اسلوب تجزیاتی ہے۔
2. تحقیق میں بنیادی اسلامی مصادر میں (قرآن مجید، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سیرت ابن ہشام ،طبقات الکبری از محمد بن سعد، البدیہ والنہایہ از ابن کثیر)اور صوفیاء کرام کے کلام سے بنیادی مصادر میں مثنوی معنوی (از مولانا جلال الدین رومی)، دوھے بابا فرید جی (از پریمی پرکاشک)اسراء اولیا ملفوظات بابا فرید (از محمد معین الدین)، ملفوظاتِ رومیؒ (از عبدالرشید تبسم) وغیرہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔
3. تحقیق میں ثانوی مصادر میں (سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات (از خلیق احمد نظامی)، افکارِ رومی (از عبدالسلام خان) بابا شیخ فرید الدین گنج شکرؒ حالاتِ زندگی اور تعلیمات (از گربچن سنگھ) ،اور جہانِ رومی (از عبدالباقی) رواداری سیرت طیبہ کی روشنی میں (از محمد طاہر محمود)، ضیاء النبی ﷺ (از پیر محمد کرم شاہ) وغیرہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔
4. مقالے کی تحریر وتدوین کے لیے نمل فارمیٹ کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔
5. انٹرنیٹ، ویب سائٹس (مکتبہ شاملہ، ریختہ، اردو ادب، اردو پوائنٹ، مکتبہ جبریل آن لاین)، ای کتب، مجلات اور مقالہ جات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔
6. دورانِ تحقیق ماہرین اور محققین کی آراء سے استفادہ کیا گیا ہے۔

تمہید:

بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کا فلسفہ تصوف

اللہ تعالیٰ نے انسان کو روح اور جسم کے دو مختلف عناصر کا مرکب بنایا ہے اللہ نے جسم کی ضرورت کے لئے خوراک، لباس اور رہائش کا بندوبست کیا اور روح کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام کو بھیجا اور انہی انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعے اللہ نے دنیا و آخرت کے مکمل اصول و ضوابط بتائے جن پر عمل پیرا ہو کر ایک انسان دنیا و آخرت میں کامیابی و کامرانی حاصل کر سکتا ہے۔ انبیاء کرام نے جو تعلیمات دیں ان کو آگے پہنچانے میں صوفیا کرام نے اہم کردار ادا کیا اور اس کے ذریعے روح کی پاکی حاصل کرنے کو کہا بلکہ نہ صرف کہا اس کو عملی طور پر بھی کر کے دکھایا جس کو "تزکیہ نفس" کا نام دیا اور اس راہ پر چلنے والے کو صوفی کا نام دیا گیا۔

تصوف مذہب کی روح ہے اور اس کا مقصد ہے اللہ کی محبت، ڈر، یقین و اخلاص اور احسان جیسی کیفیات کا پیدا کرنا۔

تصوف کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بدولت انسان اللہ کا محبوب بن جاتا ہے اور تصوف کی تعلیم یہ ہے کہ حقیقی علم صرف عمل کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے پس جو صوفی عمل نہیں کرتا وہ صوفی نہیں، تصوف کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ سب انسان ہیں، اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں اس لیے مجاز اللہ کا کنبہ ہیں۔ تصوف میں جو کام اور اعمال بندے کو کرنے کی تلقین کی جاتی ہے وہ سب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کے مطابق ہوتے ہیں۔

تصوف کے بارے میں ایک غلط فہمی ہے کہ تصوف کا راستہ دنیاوی زندگی سے کٹ جانے کا نام ہے جو کہ غلط تصور ہے تصوف، تزکیہ نفس اور خواہش نفسانی سے پاک ہونے کا نام ہے جس طرح ظاہری صفائی کا خیال رکھا جاتا ہے اسی طرح باطنی صفائی کا نام تصوف ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دنیا کی محبت کو دل سے خالی رکھنے کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ مال و دولت اور نوکر و غلام وغیرہ اپنے پاس تھے، سب اللہ کے رسول ﷺ کے گوش گزار کر کے صرف ایک چادر لیے ہوئے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جب نبی کریم ﷺ نے دریافت کیا کہ اے ابو بکر! اپنے اہل و عیال کے لیے کیا چھوڑا ہے؟

تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''صرف اللہ اور اس کا رسول ﷺ''[1]

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دنیاوی سامان کو اپنے سے دور کر کے اس بات کو مزید واضح کر دیا کہ ان کا دل دنیا کی خوبی و لطافت سے خالی ہو گیا اور اس کی کدورت سے بھی انھوں نے ہاتھ اُٹھا لیا۔ اور یہی وہ صفات ہیں جو ایک سچے صوفی میں پائی جاتیں ہیں۔

مختصر یہ کہ دنیا اور اس کی چیزوں سے اپنے دل خالی کر کے اس میں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی محبت کو بھر دینے کا نام تصوف ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں علم تفسیر، علم حدیث، علم فقہ و اصول فقہ وغیرہ سارے علوم موجود تھے لیکن ان علوم کو کوئی مخصوص نام نہیں دیا گیا تھا پچھلے علماء نے دین کی تائید و تبلیغ کے لیے ایک ایک علم الگ کر کے اس کے قواعد مقرر کئے اسی طرح علم تصوف کو بھی مشائخ کرام نے قرآن و حدیث سے نکال کر باطن کی صفائی کے بعض اذکار و اشغال و مراقبات خاص طریقہ سے بتائے ہیں کہ ان پر عمل کر کے انسان کو تزکیہ باطن جلد نصیب ہو جاتا ہے۔ ماحصل یہ کہ پورا دین نام ہے فلاح آخرت اور رضائے الٰہی کے حاصل کرنے کا اور جیسا کہ الظاہر والباطن کی مخلوق و مظہر ساری کائنات کا ہر ہر ذرہ ظاہر و باطن دونوں کا مظہر ہے اور انسان اسی کا مظہر ہے۔ ظاہری علوم دین کا تعلق ظاہری اعمال و احکام یا ظاہر کی درستی و آراستگی سے ہے اور علم باطن یا تصوف کا تعلق باطن کی درستی و آراستگی سے ہے۔ اس لیے دین میں بھی کمال رسی اور حقیقت بلا تصوف یا صوفی بنے بغیر ممکن نہیں۔[2]

تصوف کا معنی

صوفی اور تصوف کے معانی ساتویں صدی ہجری تک دریافت نہیں ہوئے تھے بلکہ اس پر غور و فکر جاری تھا علوم احسان و یقین کو آج کل تصوف کا نام دیا جاتا ہے۔

تصوف کا اصل مادہ 'صوف' ہے جس کا معنی ہے اون اور تصوف کا لغوی معنی ہے اون کا لباس پہننا۔

اصطلاح میں اس کے معانی ہیں اپنے اندر کا تزکیہ اور تصفیہ کرنا یعنی اپنے نفس کو نفسانی کدورتوں اور رذائلِ اخلاق سے پاک و صاف کرنا اور اخلاق حسنہ سے مزین کرنا۔ تصوف اصل میں اخلاق کی پاکیزگی، باطن کی صفائی، آخرت کی فکر، قلب کی طہارت اور دنیا سے بے رغبتی کا نام ہے تصوف بندے کے دل میں جہاں اللہ تعالیٰ کی ذات سے محبت

---

[1] ہاشمی، طالب، سیرت **خلیفۃ الرسول سیدنا ابو بکر صدیق** ؓ، (لاہور: حسنات اکیڈمی، 1990)، ص 108-106۔

[2] ندوی، عبد الباری، **تجدید تصوف و سلوک** (لاہور: المکتبہ الاشرفیہ، 1949)، ص 32۔

اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا جذبہ پیدا کرتا ہے، وہیں تحمل، برداشت، حسن اخلاق، رواداری اور خدمت خلق کی طرف بھی انسان کو راغب کرتا ہے۔[1]

علماء کے نزدیک تصوف کی تعریف:

تصوف کی اہل علم نے بہت ساری تعریفیں کی ہیں جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں۔

"وسئل سمنون عن التصوف فقال:أن لا تملك شيئا ولا تملك شيئ[2]"

ترجمہ: تصوف یہ ہے کہ تو کسی چیز کا مالک نہ بنے اور نہ کوئی چیز تمہاری مالک بنے۔

"سمعت أبا حاتم السجستانی يقول:سمعت أبا نصر السراج يقول:سئل عن أهل التصوف فقال:هم قوم اثروا الله.عزوجل. على كل شئ فاثرهم،عزوجل، على كلى شئ"[3]

ترجمہ: ابو نصر السراج[4] سے تصوف کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر ترجیح دی ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو ہر چیز پر ترجیح دی ہے۔

"وليس يشهد لهذا الاسم من حيث العربية قياس ولا اشتقاق، والأظهر أنه كاللقب، فأما من قال إنه من الصوف، وتصوَّف إذا لبس الصوف كما يُقال تقمَّص إذا لبس القميص، فذلك وجه، ولكن القوم لم يختصُّوا بلبس الصوف، ومن قال إنهم منسوبون إلى صفة مسجد الرسول، فالنسبة إلى الصفة لا يَجيء على نحو الصوفي، ومن قال إنه من الصفاء، فاشتقاق"[5]

---

[1] احمد کمالی، "تصوف کا مفہوم"، جسارت بلاگ، 31 مئی 2021۔

[2] معدي، الحسيني الحسيني، **موسوعة الصوفية** (قاهره: كنوز للنشر والتوزيع، 2013)، ص 1116۔

[3] قشیری، عبدالکریم، **الرسالة القشيرية** (قاهره:موسة دار الشعب للصحافة واطباعة والنشر،1989)ص37۔

[4] Abū Naṣr ʿAbd Allāh bin ʿAlī al-Sarrāj (died 988) was a Sunnī shaīykh and ascetic born in Ṭūs, Iran. He is best known for his seminal *Kitāb al-luma'* (Book of Light), which is considered as encyclopedia of the history of early Sufism. See for more details; J.L. Esposito, *The Oxford Dictionary of Islam*, (New York: Oxford University Press, 2004), 279.

[5] ibid., 37.

ترجمہ: عربی زبان کی رُو سے اس نام کی اصل کی شہادت نہ قیاس سے ملتی ہے نہ اشتقاق سے، واضح امر تو یہی ہے کہ یہ نام لقب کی طرح ہے۔ اب رہے یہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ یہ لفظ صوف سے نکلا ہے کیونکہ عربی میں جب کوئی صوف کا لباس پہنے تو اس کے لیے تصوف کا لفظ بولتے ہیں۔ جس طرح قمیص پہنے کے لیے تقمص کا لفظ بولا جاتا ہے۔ تو یہ اس کے اشتقاق کی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ مگر ان لوگوں کا مخصوص لباس صوف نہ تھا، البتہ اکثر یہی پہنا کرتے تھے۔

"من قال:إنهم منسوبون إلى صفة مسجد رسول الله صلى الله عليه وسلم ، فا لنسبةإلى الصفة لا يَجيء على نحو الصوفى"[1]

ترجمہ: جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ صوفی کا لفظ مسجد رسول ﷺ کے صفہ کی طرف منسوب ہے تو یہ درست نہیں، کیونکہ صفہ کا اسم نسبت صفہ آتا ہے صوفی نہیں آتا۔

"وقول من قال :إنه مشتق من الصف ،فكأنهم فى الصف الاول بقلوبهم فالمعنى صحيح،ولكن اللغة لا تقتضى هزه النسبة الى الصف. ثم إن هزه الطا ئفة أشهر من أن يحتاج فى تعينهم الى قياس لفظ واستحقاق اشتقاق"[2]

ترجمہ: جن لوگوں نے یہ کہا کہ یہ صف سے مشتق ہے، بمعنی کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری کا باعث، یہ لوگ اپنے دلوں کی وجہ سے صف اول میں ہیں، تو یہ معنی تو درست ہیں۔ مگر لغوی طور پر صف کا اسم نسبت صفی آتا ہے، صوفی نہیں آتا، مزید برآں یہ لوگ اس نام سے اس قدر مشہور ہو چکے ہیں۔ کہ ان کے تعین کرنے میں نہ قیاس کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ اشتقاق کی۔

مندرجہ بالا تعریفوں سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ تصوف اس طریقے کا نام ہے جس کے مطابق ایک آدمی دنیاوی خیالات سے آزاد ہو کر مکمل طور پر اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دے۔ نبی کریم ﷺ قرآن کی تعلیم دینے اور حکمت کے ساتھ تزکیہ نفس کے طریقوں کو بتانے کے لیے مبعوث کیے گئے تھے۔ تزکیہ کے مطابق ایک آدمی روحانی پاکیزگی اور خلوص نیت سے خدا کے احکام کو سرانجام دے اور ہر وقت خوف خدا کے سائے میں رہے۔ برائی سے بچنے کی کوششیں کرے۔ نبی کریم ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ریاضت کرے اور اللہ کی رضا اور خوشنودی

[1] F. du Pre Thornton, *Arabic Series: Elementary Arabic; Second Reading Book by Reynold A. Nicholson, Arabic Series* (London: Cambridge University Press, 1909), 57.
[2] Ibid., 40.

حاصل کرنے کی خواہش اپنے اندر پیدا کرے۔اپنے کردار میں ایمانداری، انصاف، معیاری اخلاق اور خوش اسلوبی کے ساتھ ساتھ اپنے اندر قوت برداشت کو بھی پیدا کرے یہ ساری باتیں تزکیہ نفس کے بعد ہی حاصل ہوتی ہیں اور یہی کام تصوف کا ہے۔

بابا فریدؒ کا فلسفہ تصوف

بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی تعلیمات، فلسفہ، شاعری اور روزمرہ کی زندگی ایک ایسے ضابطہ حیات کا نمونہ ہیں جو اللہ سے محبت و سرشاری، خدمت خلق، انسانی برداری اور رواداری، اخلاق اور صبر و قناعت کی صفت سے آراستہ ہے۔ بابا فریدؒ کی حیات اور ان کے فلسفہ سے صاف ظاہر ہے کہ خالقِ کائنات کی خوشنودی اور معرفتِ حق ان کا اولین مقصد تھا۔ان کی یہ جستجو انفرادی عمل نہیں ہے بلکہ انہوں اپنے عمل اور کردار سے اس کو ایک اجتماعی جستجو کی شکل دی اور یہ جستجو مقامی سے عالمی سطح پر منظم ہو کر ایک عالمگیر روحانی تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔

بابا فریدؒ کے نزدیک ہر انسان کسی مذہب، رنگ، نسل، مسلک اور سماجی رتبہ میں کوئی خاص اہمیت کا حامل نہ تھا۔انہوں نے رسمی طور پر باقاعدہ کسی مخصوص فلسفہ یا طرزِ فکر کی تبلیغ کی ہو۔ بابا فریدؒ نفس کو قابو کر کے قلب کو سنوارنے کی تلقین کرتے تھے۔

بابا فرید الدین گنج شکرؒ فرماتے ہیں:

''صوفیا دنیا اور دنیا کی چیزوں کے دشمن ہیں اور اپنے مولی کے دوست ہیں ''[1]

پھر فرمایا: ''راہ طریقت اور مذہب تصوف میں بنیادی چیز یہ ہے کہ انسان ہمہ وقت خاموش رہے اور عالم تحیر میں مستغرق رہے۔''

تصوف یہ ہے کہ:

''تمہاری ملکیت میں کچھ باقی نہ رہے اور تم کہیں موجود نہ ہو۔ تصوف صاف دلی کے ساتھ اللہ کی دوستی کا نام ہے اور صوفیا دنیا اور آخرت میں سوائے محبتِ خالق کے اور کسی چیز پر فخر نہیں کرتے ہیں''۔[2]

---

[1] گنج شکرؒ، فرید الدین، **اسرار اولیا اُردو ترجمہ ملفوظات**، مترجم محمد معین الدین دردائی (کراچی: رشید اینڈ سنز پرنٹرز ناظم آباد، 1971) ص128۔

[2] گنج شکرؒ، **اسرار اولیا اُردو ترجمہ ملفوظات**، ص129۔

بابا فریدؒ نے اپنے معتقدین اور سالکین کو رہبانیت کا درس نہیں دیا۔ ان کے اعمال و افکار سے یہی ظاہر ہے کہ دنیا میں رہ کر دنیاوی ذمہ داریوں سے کوتاہی نہیں برتی جاسکتی۔ تاہم ان ذمہ داریوں کی انجام دہی ذکر حق اور اللہ تعالیٰ کے اصولوں کی پیروی میں رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔

بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے نزدیک اہل تصوف حق میں ایسے ڈوب جاتے ہیں کہ ان کو کسی مخلوق کی خبر نہیں رہتی اور بات چیت ان کے درمیان سے ختم ہو جاتی ہے اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ کے حضور مشغول رہتے ہیں اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے دوست رہتے ہیں اور دنیا سے غافل ہو جاتے ہیں۔

بابا فریدؒ کا فلسفہ یہی کہتا ہے کہ قلب کو دنیا کی محبت سے پاک کر کے اُس خالق کے حوالے کر دو اور ساری زندگی اُس کی بندگی کرو۔ صوفی ازم ایک طور سے اخلاقی تعلیمات کا مجموعہ اور مذہبی فلسفہ ہے جو فقر درویش کی روایت ہے اور یہ بابا فریدؒ کی زندگی اس کا بہترین نمونہ ہے۔ جو اپنے طور پر سچائی اور اچھائی کے تصور کو ایک پاکیزہ تصویر کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ بابا فریدؒ کی تعلیمات اور ان کے فلسفے کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ایک دوسرے کے عقائد کے طریقوں سے قریب لانا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ آپس میں پھوٹ پیدا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بابا فریدؒ کو شریعت سے جو گہری عقیدت تھی وہ طریقت کی بنیاد تھی۔ انہوں نے زندگی بھر محبت کا راستہ ااختیار کیا اور ہمیشہ یہ چاہا کہ انسانی دکھوں کو کم کر کے امیری اور غریبی کے فرق کو مٹایا جائے۔ زبانوں اور بولیوں کی اس طرح خدمت کی جائے کہ دور تک اور دیر تک یہ پھول کھلے رہے اور ان کی خوشبوئیں بکھرتی رہیں۔[1]

بابا فریدؒ کے فلسفہ میں جو واضح بات نظر آتی ہیں وہ یہ ہیں کہ انہوں نے وحدت الوجود ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ اللہ ایک ہے۔ اس کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، صرف وہی عبادت کے لائق ہے۔ اہل تصوف کا یہ عقیدہ ہے کہ کائنات میں صرف خدا کی ذات ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے سب خدا ہی خدا ہے۔ کائنات کی تمام اشیاء جو جسم اختیار کیے ہوئے محدود صورت میں ہمیں نظر آتی ہیں یہ سب خداوندی کی مظاہر ہیں۔ توحید کا آخری مرتبہ بھی یہ ہے کہ بندہ صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہی کو موجود دیکھے، یہی صدیقین کا مشاہدہ ہے اور صوفیاء اسے ہی فنافی التوحید کہتے ہیں۔

---

[1] ذاکر، کشمیری لال، **حضرت بابا فریدؒ گنج شکر فن اور شخصیت** (ہریانہ: ہریانہ اردو اکادمی، 2010)، ص126۔

مولانا روم کا فلسفہ تصوف

تصوف دراصل تصحیح خیال کا نام ہے یعنی جو خیال قائم کیا جائے وہ اصل حالت میں ہو مثلاً ''اگر توکل کا مقام درپیش ہو تو یہ حالت طاری ہو جائے کہ انسان تمام عالم سے قطعاً بے نیاز ہو جائے''

مولانا کے نزدیک یہ دنیا عارضی ہے ان کا کہنا ہے کہ سالک اپنی ہستی کو بالکل مٹا دے اور ذاتِ الٰہی میں فنا ہو جائے کیونکہ ساری کلفتیں دنیا کی دلی وابستگی سے ہوتی ہے۔ اگر آدمی اس دنیا کی دل چسپی سے آزاد ہو جائے اور اپنے آپ کو بالکل مسافر سمجھ کر جو گرم و سرد، شیریں و تلخ حالت پیش آئیں ان کو دائمی نہ سمجھے اور یہ خیال کرے کہ مجھے ہمیشہ اس حالت پر نہیں رہنا بلکہ اس کے بعد کوئی دوسری حالت آنے والی ہے اور مجھے آگے چلنا ہے پھر ہر حالت میں یہی خیال رکھے تو کوئی کلفت پیش ہی نہ آئے۔

مولانا رومؒ کے نزدیک تصوف کا فلسفہ شریعت اور طریقت کی راہوں پر چل کر حاصل ہوتا ہے۔ وہ اس کو اِس طرح بیان کرتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک شخص نے علم طب پڑھا یہ شریعت ہے، دوا استعمال کی یہ طریقت ہے، مرض سے افاقہ ہو گیا یہ حقیقت ہے۔ حاصل یہ کہ شریعت علم ہے طریقت عمل ہی حقیقت عمل کا اثر ہے۔

اس پر مزید مولانا فرماتے ہیں کہ شریعت چار چیزوں کا نام ہے۔ اعتقادِ قلبی، تزکیہ اخلاق اور اعمال یعنی اوامر و نواہی۔ ان چار چیزوں میں سے دوسرے نمبر پر تصوف ہے۔ اس بارے میں مولانا فرماتے ہیں کہ تصوف میں جو چیز اصلی الاامتیاز ہے وہ یہ ہے کہ اس میں علم اور ادراک کا طریقہ عام سے مختلف ہے۔ تمام حکماء اور علماء کے نزدیک ادراک کا ذریعہ حواس ظاہری اور باطنی یعنی حافظہ تخیل جس میں مشترک ہیں۔ لیکن اہل تصوف کے نزدیک ان وسائل کے سوا ادراک کا ایک اور بھی ذریعہ ہے کہ مجاہدہ، ریاضت، مراقبہ اور تصفیہ قلب سے ایک اور حاسہ پیدا ہوتا ہے جس سے ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو حواس ظاہری و باطنی سے معلوم نہیں ہوتیں۔

مولانا رومی اپنے فلسفہ تصوف میں بیان کرتے ہیں کہ انبیاءاور اولیامیں فرق یہ ہے [1]کہ انبیاء میں یہ علم نہایت کامل اور فطری ہوتا ہے، یعنی مجاہدہ اور ریاضت کا محتاج نہیں ہوتا،اور اس کے بر عکس اولیاء کو مجاہدات اور ریاضات کے بعد حاصل ہوتا ہے۔[2]

مندرجہ بالا فلسفہِ تصوف کی بحث سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ طریقت در حقیقت شریعت ہی کا باطن ہے۔ شریعت جن اعمال و احکام کی تکمیل کا نام ہے ۔ان اعمال و احکام کو حسن نیت اور حسن اخلاص کے کمال سے آراستہ کر کے نتائجِ شریعت کو درجہ احسان پر فائز کرنے کی کوشش دراصل تصوف ہے۔اپنے نفس کا مجاہدہ کرنا اُس کو قابو میں رکھنا اور نفس کو خواہشات کے تابع کرنے کے بجائے اپنی خواہش کو اپنے نفس کے مطابق کرنا ہوتا ہے اور یہ کام ریاضت اور مجاہدے سے ہوتا ہے اور جو شخص ایسا ہو وہ صوفی ہے۔

مولانا رومؒ کے فلسفہ میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں طرح کا نظریہ ملتا ہے۔ نظریہ وحدۃ الوجود کے میں کائنات کا زرہ زرہ ایک دوسرے کے عین ہے اور وحدت الشہود کا نظریہ، یہ ہے کہ ذاتِ خداوندی اور اشیائے کائنات ایک دوسرے کے عین نہیں بلکہ غیر ہیں۔خدا کی ذات ہماری و قل و فہم کی رسائی سے باہر ہے۔

---

[1] امت کے تمام سلف صالحین اور آئمہ کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ نبی ﷺ کے علاوہ باقی کوئی شخص بھی کیوں نہ ہو۔اس کے بعض قول قبول کیے جا سکتے ہیں اور بعض ترک کیے جا سکتے ہیں،اور یہ انبیاء، غیر انبیاء کا فرق ہے۔انبیاء کی طرف سے جو خبر دیں ان سب پر ایمان لانا ضروری اور انکے حکم کی اطاعت کرنا واجب ہے لیکن اولیاء کے ہر حکم کی اطاعت واجب نہیں ہے اور نہ انکی ہر خبر پر ایمان لانا ضروری ہے۔بلکہ انکا ہر حکم اور انکی ہر خبر کتاب وسنت کے سامنے پیش کی جائے گی، جو کتاب وسنت کے موافق ہو مان لی جائے ورنہ رد کر دی جائے گی۔

[2] شبلی نعمانی، **سوانح مولانا روم**،(بنگال: ممبر رائل ایشیاٹک سوسائٹی، 1906)، ص176۔

باب اول

بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ: شخصیت، تعلیمات اور حالاتِ زندگی

فصل اول: بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کا تعارف

فصل دوم: بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کے دور کا ماحول

باب اول: بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ: شخصیت، تعلیمات اور حالاتِ زندگی

بابا فریدؒ جن کا نام پنجاب میں آٹھ سو سال سے نہایت عزت و احترام سے لیا جاتا ہے، وہ ایک مایہ ناز صوفی بزرگ ہی نہ تھے بلکہ روحانی راہ نما بھی تھے۔ بابا فریدؒ ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے اور انہوں نے پنجاب کی سر زمین پر روحانیت کا مرکز قائم کیا۔ ہندوستان میں وہ سلسلہ چشتیہ کے ابتدائی مبلغین میں ان کا شمار ہوتا ہے بابا فریدؒ کا مقام بہت بلند ہے انکی زندگی میں ہزاروں گمراہ لوگوں نے راہ ہدایت حاصل کیا۔

فصل اول: بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کا تعارف

بابا فریدؒ ملتان کے قریب ایک گاوں کھتوال[1] میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم اپنی والدہ ماجدہ سے حاصل کی جو کہ ایک نیک خاتون تھی۔ حضرت بابا فریدؒ کے جدامجد فرخ شاہ ملک کابل کے حاکم تھے۔ آپ کے والد شیخ جلال الدین، سلطان شہاب الدین غوری[2] کے عہد سلطنت میں کابل سے ملتان آئے اور بادشاہِ وقت نے آپ کو قاضی بنا دیا[3]۔ بابا فریدؒ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ ملتان چلے گئے اور اُدھر اس مدرسہ میں داخل ہوئے جو مولانا منہاج الدین ترمذی کی مسجد میں تھا۔ بابا فریدؒ نے ہوش سنبھالتے ہی یادالٰہی کا دامن پکڑ لیا۔ تزکیہ نفس کی بناپر وہ اللہ کے محبوب بندے بن گئے۔ ادھر ہی انکی ملاقات خواجہ قطب الدین[4] سے ہوئی۔ ظاہری علوم حاصل کرنے کے بعد آپ باطنی علوم حاصل کرنے کے لیے ان کے پاس دہلی چلے آئے، اس کے بعد آپ ہانسی[5] میں ہی تھے تو قطب الدین کی وفات کی خبر ملی تو آپ فوراً دہلی آ گئے یہاں آ کے منصب خلافت سنبھالی لیکن کچھ وجوہات کی بناپر آپ واپس ہانسی تشریف لے گئے پھر جب اُدھر ہجوم میں اضافہ ہوا تو آپ نے اجودھن میں تشریف لے گئے وہاں پر ہی مستقل سکونت اختیار کی اور آخر وقت تک اسی جگہ قیام کیا۔[6]

---

[1] قصبہ کھتوال کا موجودہ نام دیواں چاولی ہے۔ جو بورے والا سے دس کلو میٹر کے فاصلے پر ضلع وہاڑی میں واقع ہے۔

[2] شہاب الدین، سلطنت غوریہ کا دوسرا اور آخری حکمران تھا۔ جو 1202ء سے 1206ء تک سلطنت غوریہ کا حکمران رہا۔

[3] جمالی، حامد بن فضل اللہ، **سیر العارفین**، مترجم، محمد ایوب قادری، (لاہور: مرکزی اردو بورڈ، 1976)، ص 43-42۔

[4] حضرت قطب الدین بختیار کاکی (1235-1137) دہلوی برّ صغیر کے صوفی بزرگ، سُلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے محبوب ترین خلیفہ اور بابا فرید الدین گنج شکر کے پیر و مرشد ہیں۔

[5] ہانسی موجودہ بھارت کی ریاست ہریانہ میں واقع ہے۔

[6] جمالی، سیر العارفین، ص 44۔

نام ونسب

بابافرید الدین گنج شکرؒ سلسلہ چشتیہ کے ان نامور بزرگوں میں سے ہیں جن کی وجہ سے اس سلسلہ کی ترقی واشاعت میں اضافہ ہوا۔ بابافریدؒ قصبہ کھتوال میں 571ھ بمطابق 1175ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام مسعود بن سلیمان ہے لیکن آپ فرید الدین کے نام سے مشہور ہو گئے۔ آپ کے والد آپ کی ولادت سے پہلے فوت ہو گئے۔ جس کی وجہ سے آپ کی ساری ذمہ داریاں آپ کی والدہ پر تھی۔ آپ کے والد کا نام مولانا جلال الدین سلیمان تھا جو کابل کے بادشاہ فرخ شاہ کی اولاد میں تھے آپ کی والدہ ماجدہ کا نام بی بی قرسم خاتون بنت مولانا وجیہہ الدین ہے۔[1]

گنج شکر کی وجہ تسمیہ

بابافریدؒ کا سب سے مشہور لقب حضرت گنج شکر (یعنی شکر یا مٹھاس کا خزانہ) ہے۔ آپ کے اس لقب کے بارے میں بہت ساری باتیں مشہور ہے لیکن جو سب سے زیادہ مشہور ہے وہ زیرِ بیان ہے۔

آپ کے والد کے انتقال کے بعد آپ کی تمام تر ذمہ داری آپ کی والدہ پر تھی انہوں نے شروع سے ہی آپ کو نماز کا پابند بنانا چاہا۔ اس لیے آپ کی والدہ جائے نماز کے نیچے شکر رکھ دیتی اور اپنے بیٹے سے کہتی کہ جو بچے نماز پڑھتے ہیں تو ان کی جائے نماز کے نیچے سے روزانہ ان کو شکر ملتی ہیں۔ ایک دن آپ کی والدہ شکر کی پڑیا رکھنا بھول گئیں تو انہوں نے گھبرا کر پوچھا:

مسعود! کیا آج تم نے نماز پڑھی؟

تو انہوں نے جواب دیا: ''جی اماں جان نماز بھی پڑھی اور شکر کی پڑیا بھی مل گئی''۔

یہ سن کر آپ کی والدہ کو بہت تعجب ہوا، اور وہ سمجھ گئیں کہ اس بچے کی غیب سے مدد ہوتی ہیں۔ تب سے آپ کی والدہ نے آپ کو ''گنج شکر'' کہنا شروع کر دیا۔[2]

---

[1] فقری، **شانِ حضرت بابافرید گنج شکر**، (لاہور: اشتیاق پرنٹرز لاہور، 2004)، ص22۔

[2] ایضاً، ص26۔

ابتدائی تعلیم

بابا فریدؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے قصبہ کھتوال سے ہی حاصل کی آپ کی والدہ نے آپ کی تعلیم پر خاص توجہ دی اور جب آپ کی عمر پڑھنے والے بچوں کی ہوئی تو انہوں نے آپ کو مسجد میں داخل کروادیا، اور آپ نے وہاں سے قرآن مجید کی ابتدائی تعلیم حاصل شروع کر دی جب آپ کی عمر اٹھارہ برس کی ہوئی تو آپ قرآن مجید کی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ تب آپ کی والدہ نے آپ کو مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے ملتان بھیج دیا اور اُدھر جا کر آپ نے درس والی مسجد میں قیام کیا اور وہاں منہاج الدین ترمذی سے فیض حاصل کرنے لگے انہوں نے آپ کو ایک ذہین اور قابل شاگرد پایا تو آپ پر خاص توجہ دینا شروع کر دی۔ بابا فرید الدین نے کچھ ہی عرصہ میں قرآن و حدیث، تفسیر و فقہ، منطق اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کر لی۔[1]

آپ ملتان میں قیام فرمانے کے بعد ظاہری علوم کے حصول میں دن رات کوشاں رہنے لگے۔ ملتان میں ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد بھی چونکہ آپ ایک تشنگی سی محسوس فرماتے تھے۔ اس لئے حصول علم کے شوق میں ملتان سے قندھار جا پہنچے اور وہاں پانچ برس تک تحصیل علم فرماتے رہے اس کے بعد آپ نے اسلامی ممالک کی سیاحت شروع کی۔ علوم ظاہری کی تکمیل، اسلامی ممالک کی سیاحت اور بزرگان دین سے مستفید ہونے کے بعد جب آپ وطن آئے تو وہاں سے سیدھا حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی خدمت میں دہلی روانہ ہو گئے۔ چنانچہ دہلی میں میں آپ کی شہرت اتنی بڑھی کہ آپ کے حجرہ کے باہر اچھا خاصا ہجوم رہنے لگا عوام کے اس غیر معمولی ہجوم سے آپ گھبرائے اور قصبہ ہانسی تشریف لے گئے اور وہیں عبادت و ریاضت میں مصروف رہنے لگے۔ جب حضرت خواجہ کا وصال ہوا تو آپ ہانسی میں ہی تھے یہ خبر سن کر فوراً دہلی آئے اور خلافت، عصا اور مصلی وغیرہ حاصل کیا اور بطور جانشین کے خدمات انجام دینا شروع کر دیں جب ہجوم میں اضافہ ہوا تو وہاں شیخ جمال الدین ہانسوی کو اپنا جانشین اور خلیفہ بنا کر اجودھن چلے گئے۔ یہاں اجودھن میں شادی کی اور اولاد ہوئی اور یہیں رہ کر آپ نے اسلام کی تبلیغ شروع کی یہ ایسی جگہ تھی جہاں تجارت کی غرض سے بہت سے قافلوں کا گزر ہوتا اور قیام کرتے آپ نے اس جگہ کو اپنے لیے مناسب سمجھا۔[2]

---

[1] ۔ فقری، **شانِ حضرت بابا فرید گنج شکر**، ص29۔

[2] ۔ ایضا، ص31۔

اخلاق وعادات

حضرت بابا فریدؒ کی حیات طیبہ کا ہر پہلو اچھے اخلاق کی منہ بولتی تصویر ہے۔ان کی ساری زندگی کتاب وسنت پر عمل کا انمول خزانہ ہے۔ان کا ظاہر اور باطن یکساں تھا۔زندگی میں صداقت ہی صداقت تھی غرض یہ کہ آپ میں حلم و بردباری، گفو ودرگزر، جود وسخا، عجز وانکساری، فقر واستغنیٰ، اخوت ومروت، صدق وصفا، دیانت وامانت، توکل و قناعت، صبر و شکر، استقامت و مستقل مزاجی، احسان و ایثار، خدمت و قربانی جیسی تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔اپنی اخلاقی خوبیاں سے بے شمار ہندو اور غیر مسلم متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔[1]

سلسلہ باطنی

چشت، خراسان کے ایک مشہور شہر کا نام ہے[2]۔وہاں کچھ بزرگانِ دین نے روحانی اصلاح اور تربیت کا آغاز کیا اور ایک بڑا مرکز بن گیا۔اس کو بہت شہرت حاصل ہوئی اور وہ نظام اس مقام کی نسبت چشتیہ کہلانے لگا۔اس سلسلہ کے پہلے بزرگ خواجہ ابو اسحاق شامی[3] (940ء) کا نام ملتا ہے[4]۔اس سلسلہ میں جو نام دوسرے نمبر آتا ہے وہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ[5] کا ہے جنہوں نے ہندوستان میں آکر اس سلسلہ کی اشاعت کی اسلام کی تبلیغ میں نمایاں کردار ادا کیا ،ان کے مرید خواجہ قطب الدین بختار کاکیؒ بھی ان کے ساتھ اس کام میں پیش پیش تھے۔لیکن اس سلسلہ کی نشر و اشاعت کے کام میں جو کردار بابا فرید الدینؒ نے ادا کیا وہ سب سے نمایاں ہے۔تصوف کے تمام بزرگوں میں سے بابا فرید الدین گنج شکرؒ کا نام سب سے زیادہ مقبول ہے اور اس کی خانقاہیں نہ صرف ہندوستان، بلکہ دنیا کے کونے کونے میں

---

[1]۔ فقری، **شانِ حضرت بابا فرید گنج شکر**، ص114،

[2] چشت افغانستان کے ہرات رود، اوبہ اور شاقلان کے قریب ایک گاؤں کا نام ہے۔سلسلہ چشتیہ کا آغاز اسی گاؤں سے ہوا۔ یہ ہرات کے پہاڑوں میں واقع ہے جو دراصل ہرات کا ہی حصہ ہے۔خواجہ معین الدین چشتی کا تعلق بھی اسی گاؤں سے ہے

[3] شیخ ابو اسحق شامی کا لقب شرف الدین تھا۔ خلیفہ چہارم علی کی نویں پشت سے تھے۔ مرشد نے جب نام پوچھا تو ابو اسحاق شامی بتایا۔ مرشد نے کہا آج سے لوگ تمہیں ابو اسحٰق چشتی کہیں گے اور جو بھی تمہارے سلسلے میں داخل ہوگا، چشتی کہلائے گا۔

[4] ۔ نظامی، خلیق احمد، **تاریخ مشائخ چشت** (دہلی: مطبوعہ اشوکا پریس، 1953)، ص47۔

[5] سُلطان الہند خواجہ سیّد معین الدین چشتی (1142ء-1236ء) عالم، فلسفی، صوفی اور زاہد نیز اجمیری سلسلۂ چشتیہ کے مشہور بزرگ تھے۔ان کا آبائی وطن سیستان تھا۔ 13ویں صدی کے اوائل میں انہوں نے برصغیر کا سفر کیا اور یہیں بس گئے اور تصوف کے مشہور سلسلہ چشتیہ کو خوب فروغ بخشا۔ تصوف کا یہ سلسلہ قرون وسطی کے ہندوستان میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس طریقت کو کئی سنی اولیا نے اپنایا جن میں نظام الدین محمد اولیاء (وفات: 1325) اور امیر خسرو (وفات: 1325) جیسی عظیم الشان شخصیات بھی شامل ہیں۔ معین الدین چشتی کو برصغیر کا سب سے بڑا ولی اور صوفی سمجھا جاتا ہے۔

پھیلی ہوئی ہیں۔اس سلسلہِ تعلیم میں معلم کو مرکزی اہمیت حاصل ہوتی ہے، شاگرد کے لیے پیر ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ پیر و مرشد ہی مرید کے لیے عملی امتحانات کی اقسام اور ان کی مدت مقرر کرتا ہے اور وہی حقیقی معنوں میں تعلیم کا کام انجام دیتا ہے۔ اگر مرشد تعلیم دے رہا ہو اور وہ کسی طریقے کو ناپسند کرتا ہے تو مرید کی مجال نہیں کہ وہ پیر و مرشد کے خلاف جائے۔ پیر و مرشد اپنے مرید کو بھٹی میں تپا کر کندن بنا دیتا ہے تاکہ عوام کی خدمت کے لیے مرید کو پوری طرح سے تیار کر دے۔[1]

وفات

بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ نوے سال تک زندہ رہے اور آخر محرم کی 5 تاریخ 664 ہجری (1265 عیسوی)[2] کو نمازِ عشاء کے بعد آپ پر بے ہوشی کا عالم طاری ہو گیا جب ہوش میں آئے تو پھر سے نماز میں مصروف ہو گئے۔ اسی دوران نہایت سکون سے اس دنیا سے اُس دنیا میں منتقل ہو گئے۔ وقت نزع ان کے خاندان کے افراد اور مریدان کے سر بالیں دست بدعا کھڑے تھے۔

مندرجہ بالا وضاحت سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بابا فریدؒ ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ والد کا سایہ سر پر نہ ہونے کے باوجود بھی انکی والدہ نے انکی تربیت میں کوئی کمی نہ چھوڑی اور انکو نہ صرف ایک مضبوط شخصیت کے طور پر اُبھارا اور ہمارے لیے ایک ایسی مثال چھوڑی جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور نبی ﷺ کی تعلیمات کو بنیاد بنا کر معاشرے میں امن و رواداری کی فضا قائم کیں۔

مولانا روم کا تعارف اور حالاتِ زندگی

مولانا روم 6 ربیع الاول کو بلخ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد نے اپنے خاص مریدوں میں سے سید برہان الدین محقق ترمذی[3] سے مستفید ہونے لگے ان سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے دمشق کا رُخ کیا اور جا کر مدرسہ مقدسیہ میں قیام کیا۔ دمشق کے مدرسہ سے فیضیاب ہونے کے بعد آپ نے واپس آ کر قونیہ میں مکمل رہایش اختیار کر

---

[1] نظامی، خلیق احمد، **تاریخ مشایخ چشت**، ص48۔

[2] طالب، گربچن سنگھ، **بابا شیخ فرید الدین گنج شکرؒ حالاتِ زندگی اور تعلیمات**، (پیٹیالہ: بابا فرید میموریل سوسائٹی پنجابی یونیورسٹی، 1973)، ص25۔

[3] برہان الدین محقق ترمذی (561 AH/1165-66 AD - 637 AH/1239-40 AD) سید سردان کے نام سے مشہور تھے جو ساتویں صدی کے مشہور روحانی شخصیت تھے۔

[4] کمال الدین ابن العدیم کی پیدائش 1192ء اور وفات 1262ء میں ہوئی۔ بلاد شام کے عظیم ترین مورخین میں سے ایک تھے۔

لی،اور لوگوں میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا اس کے ساتھ ساتھ وعظ اور فتویٰ نویسی کو بھی اہم فریضہ سمجھ کر ادا کرتے رہے اور اس کام کے معاوضے میں بیت المال سے ایک دینار ملتا تھا۔[1]

نام ونسب

مولانا روم کا نام 'محمد' تھا اور یہ جلال الدین کے لقب سے مشہور تھے۔آپ کا نسب آپ کے والد کی طرف سے نو واسطوں سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے اور والدہ کی طرف سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔اور شاید اسی وجہ سے بلخ وخوارزم کے امرا و سلاطین نے اپنی شہزادیوں کی شادیاں اس خاندان میں کی مولانا کے نانا حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کی اولاد میں سے تھے۔مولانا کے آباو اجداد کا آبائی وطن بلخ تھا،جو کہ خراسان میں واقع ہے۔مولانا جلال الدین رومیؒ 6 ربیع الاول 604ء کو بلخ میں پیدا ہوئے ، جو ماوراءالنہر سے اس طرف تھا یہاں اُس وقت میں کُرد قوم آباد تھی۔بلخ کا علاقہ صوبے کا حصہ تھا۔دریا کی دوسری طرف یعنی ماوراءالنہر میں بخارا اور سمرقند وغیرہ تھے۔جہاں ترک قوم آباد تھی۔بلخ محمد خوارزم شاہ کا دارالخلافہ تھا۔اب بلخ افغانستان کے صوبہ مزار شریف کے مضافات میں ایک بستی ہے[2]۔آپ کی والدہ کا نام مومنہ خاتون تھا اور آپ کے والد کا نام شیخ بہاءالدین تھا۔جو کہ اعلیٰ پایہ کے عالم تھے۔

مولانا اور ان کے خاندان کی بلخ سے ہجرت

اس کے بارے میں ایک واقعہ مشہور ہے کہ بلخ کے خوارزم شاہ کا اپنی رعایا پر ناجائز ٹیکس اور معتقدوں کی کثرت کے علاوہ خوارزم شاہ کی مجلسوں میں دین کی حقیقی روح سے عاری علماء جو غیر دینی علوم کے نام پر عوام سے ضرائب لیتے تھے،خوارزم شاہ کی یہ گرفتیں عوام اور علماء کو ناگوار گزرتی تھیں۔حضرت بہاءالدین کو عوام کی طرف سے بہت توجہ ملتی تھی اس وجہ سے کچھ علماء آپ سے حسد کرتے تھے۔اس کے علاوہ حضرت بہاءالدین حکمائے یونان کے خلاف تھے کیونکہ کچھ لوگوں نے آسمانی کتب کو پس پشت ڈال کر فلسفیوں کے اقوال کو اپنا مسلک بنالیا تھا۔ایک روز سلطان اپنے اصحاب کے ساتھ، بہاءالدین کی خدمت میں حاضر ہوئے لوگوں کا ہجوم دیکھ ایک عالم نے سلطان سے کہا

---

[1] ندوی،سید ابوالحسن علی،**مولانا جلال الدین رومی**(اسلام آباد: دعوۃ اکیڈمی، 2011)،ص 31-29۔

[2] سید اصغر حسین،**سوانح مولانا روم**،(لاہور: ادارہ اسلامیات، س ن)،ص 8۔

کہ اگر اس فتنہ کو ادھر ہی ختم نہ کیا تو اس کے بڑھ جانے کا خدشہ ہے۔ خوارزم شاہ نے عالم کے مشورے سے بہاءالدین کو خزانے اور قلعہ کی تمام چابیاں بھیج دی اور کہہ بھیجا لوازم سلطنت میں سے میرے پاس صرف یہی رہ گیا اور یہ بھی بھیج دیا ہے۔ بہاءالدین نے پیغام دیا:

> ''سلطانِ اسلام سے میرا اسلام کہنا اور کہنا کہ اس ملک فنا کا یہ تمام خزانہ و دفینہ ملک و لشکر بادشاہوں کے لائق ہے، ہم درویشوں کو اس سے کیا سروکار؟ میں نہایت خوشی سے سفر کرتا ہوں کہ بادشاہ اپنے اتباع و احباب کے ساتھ یہاں باستقلال سلطنت کرے، جمعہ کی نماز اور وعظ کے بعد ان شاء اللہ ہم چلے جائیں گے''[1]

اس طرح مولانا کے آباو اجداد بلخ چھوڑ کر رخصت ہو گئے اور بغداد، مکہ معظمہ، دمشق اور مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے قونیہ تشریف لائے اور یہاں مستقل رہائش اختیار کر لی۔[2]

مولانا کی ابتدائی تعلیم

مولانا جلال الدین رومیؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد گرامی سے حاصل کی وہ اپنے زمانے کے اعلیٰ پایہ کے علماء میں سے تھے۔ جب شہر سے نکلے تو تین سو خاص مرید ساتھ تھے۔ اور ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے ساتھ میں مولانا روم بھی چل پڑے۔ 610ء میں جب نیشاپور پہنچے تو خواجہ فرید الدین عطار[3] آپ کے والد سے ملنے آئے تو آپ کو دیکھا اور آپ کے والد سے کہا کہ یہ گوہر قابل ہے ان کا خاص خیال رکھنا اور آپ کو اپنی کتاب اسرار نامہ پڑھنے کو دی۔ جب مولانا روم بغداد پہنچے تو ان کی عمر اٹھارہ یا انیس برس کی تھی۔ آپ کی عمر چوبیس سال کی تھی جب آپ کے والد کا انتقال ہوا تو ان سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے حلب چلے گئے وہاں کے مدرسہ حلاویہ کے اُستاد کمال الدین ابن جنگیؒ سے فقہ، حدیث، عربی لغت اور ادب کی تعلیم مکمل کی۔ 631 تک آپ حلب میں

---

[1] ندوی، **مولانا جلال الدین رومی**، ص34-32۔

[2] یہاں ایک تصحیح طلب بات ہے کی یہ مکالمہ امام فخر الدین رازی سے ہوا جو سلطان کے ساتھ تھے مگر مصنف صاحب المثنوی کی تحقیق کے مطابق یہ تاریخی غلطی ہے جو منقول چلی آرہی ہے کیونکہ حضرت بہاءالدین نے بلخ کو 609/610 میں ترک کیا اور امام رازی نے 606 میں ہرات میں انتقال فرمایا۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں، ندوی، سید ابوالحسن علی، **مولانا جلال الدین رومی** (اسلام آباد: دعوۃ اکیڈمی، 2011)، ص31۔

[3] فرید الدین عطار، (1221-1145ء) ایران کے شہر نیشابور میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام ابو حمید ابن ابو بکر ابراہیم تھا مگر وہ اپنے قلمی نام فرید الدین اور شیخ فرید الدین عطار سے زیادہ مشہور ہیں۔ عطار کا لفظی مطلب ''ادویات کے ماہر'' کا ہے جو آپ کا پیشہ تھا۔ اس کے علاوہ آپ فارسی نژاد مسلمان شاعر، صوفی اور ماہر علوم باطنی تھے۔ آپ کا علمی خاصہ اور اثر آج بھی فارسی شاعری اور صوفیانہ رنگ میں نمایاں ہے۔

رہے۔ حلب سے فارغ ہونے کے بعد دمشق کا رُخ کیا، اُدھر مدرسہ مقدسیہ میں قیام کیا اور تحصیل علم میں مصروف ہو گئے۔ 635ء تک دمشق میں رہے۔ ادھر ہی اِن کی ملاقات شیخ اکبر محی الدین ابنِ عربی سے ہوئی۔[1]

636ء میں قونیہ میں آ گئے۔ جب مولانا روم نے ظاہری علوم میں مہارت حاصل کر لی تو سید برہان الدین ترمذی نے ان کو کہا کہ آپ کے والد کی ایک امانت ہے جس کو اب لوٹانا چاہتا ہوں، پھر کئی سال تک قونیہ میں رہ کر مولانا کو تصوف اور طریقت کی تعلیم دی۔[2]

مولانا کا فضل و کمال اور آپ کے مشاغل

مولانا کا شمار اپنے عہد کے مشہور حنفی علماء میں تھا۔ فقہیات میں ان کی وسعتِ نظر کمال تھی، اس کے علاوہ اُس زمانے کے علوم میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ علم کلام میں ان کی مہارت کی اہم شہادت مثنوی ہے۔ آپ امام اور مجتہد بھی تھے۔ آپ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ فتویٰ نویسی بھی کرتے تھے۔ بیت المال سے اس خدمت کا ایک دینار روزانہ مقرر تھا، مولانا فتووں کے جوابات دینے میں بہت اہتمام کرتے تھے۔ سُکر و استغراق کے غلبے کے زمانے میں بھی حکم تھا کہ فتوی آئے تو فوراً آپ کے سامنے پیش کیا جائے۔ چنانچہ خدام ہمیشہ قلم اور دوات مہیا رکھتے اور فتویٰ آتے ہی مولانا سے اس کا جواب لکھوا لیتے۔

مولانا کے یہ مشاغل 642ھ تک برابر قائم رہے اور اس عرصے میں آپ کی زندگی خالص عالمانہ رہی سر پر عمامہ باندھتے تھے اور علماء کے انداز پر کشادہ آستینوں کی عبا یا پہنتے تھے۔ زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت، مطالعہ کتب کے ساتھ درس و وعظ، تلقین و تربیت مولانا کی زندگی تھی۔[3]

سلسلہ باطنی

مولانا کے سلسلہ کے لوگ جلالیہ کہلاتے ہیں جو کہ مولانا جلال الدین رومی کی نسبت کی وجہ سے ہے۔ آج کل ایشیائے کوچک، شام، مصر اور قسطنطنیہ میں اس فرقہ کو مولویہ کہتے ہیں۔ یہ لوگ نمد کی ٹوپی پہنتے ہیں۔ جس میں جوڑ نہیں ہوتا، مشائخ اس پر عمامہ بھی باندھتے ہیں۔ خرقہ یا کُرتے کے بجائے ایک چٹلّا دار پاجامہ ہوتا ہے۔ ذکر کا طریقہ ی

---

[1] خاں، محمد عبدالسلام، **افکارِ رومی**، (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ، 2011)، ص22۔

[2] ایضا، ص23۔

[3] ایضاً۔

ہے کہ حلقہ بنا کر بیٹھتے ہیں ایک شخص کھڑا ہو کر ایک ہاتھ سینہ پر اور ایک ہاتھ پھیلائے رقص شروع کرتا ہے اور یہ رقص مسلسل ایک ہی جگہ پر کھڑے رہ کر کرنا ہوتا ہے۔

اگر اس سلسلہ میں کوئی داخل ہونا چاہتا ہے تو اُسکا یہ طریقہ ہے۔ کہ چالیس دن چارپایوں کی خدمت کرتا ہے۔ چالیس دن فقراء کے دروازے پر جھاڑو دیتا ہے۔ چالیس دن آب کشی کرتا ہے۔ چالیس دن فراشی کرتا ہے۔ چالیس دن طباخی کرتا ہے۔ چالیس دن بازار سے سودا سلف لاتا ہے۔ چالیس دن فقراء کی مجلس کی خدمت گاری کرتا ہے اور جب یہ مدت مکمل ہو جاتی ہے تو غسل کر کے اور تمام محرمات سے توبہ کر کے حلقے میں داخل کر لیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ خانقاہ سے لباس دیا جاتا ہے اور اسمِ جلالی کی تلقین کی جاتی ہے۔[1]

وفات

مولانا جلال الدین رومیؒ کی طبعیت میں جب زیادہ خرابی ہوئی اور کمزوری بڑھنی لگی تو طبیبوں نے معائنہ کرنا شروع کیا اور علاج شروع کر دیا لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا۔ مولانا اپنا حال نہیں بتاتے تھے اور نبض سے کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ ایک روز شیخ صدر الدین قونوی[2] طبعیت کا حال معلوم کرنے آئے اور مولانا کو جلد صحت یاب ہونے کی دعا دی۔ مولانا نے فرمایا:

> ''شفا تمہیں مبارک ہو محب و محبوب میں بال برابر فرق رہ گیا ہے۔ کیا تم کو گوارہ نہیں کہ یہ بھی اُٹھ جائے اور نور، نور سے مل جائے۔''[3]

مولانا پر پچاس دینار قرض تھا کہنے لگے جو رقم موجود ہے اس کو ادا کرو اور باقی کی معاف کر دو۔ لیکن قرض خواہ نے ساری رقم معاف کر دی۔ مولانا نے چین کا سانس لیا۔ جب طبعیت زیادہ بگڑی تو حسام الدین نے پوچھا کہ جنازہ کون پڑھائے تو فرمایا صدر الدین، آخر کار 5 جمادی الاخریٰ 672ھ کو مولانا جلال الدین رومیؒ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔[4]

---

[1] شبلی نعمانی، **سوانح مولانا روم**، ص16۔

[2] صدر الدین قونوی (1274-1207 عیسوی/605-673 ہجری) ابن العربی کے براہ راست شاگرد، ایک فارسی فلسفی اور صوفیانہ فلسفہ کے سب سے زیادہ متاثر کن مفکر تھے۔ وہ نہ صرف ابن العربی کے نامزد جانشین تھے، جنھوں نے اپنی تعلیم و تحریر میں یقین کے ساتھ اپنے ورثے کو مستحکم کیا بلکہ آپ ایک عظیم روحانی پیشوا تھے، جس کے بہت سے انکشافات اور روحانی تجربات ان کے طلباء اور ان کے اپنے جریدے میں ظاہر ہیں کہ وہ شعور کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز تھے۔

[3] ایضاً: ص30۔

[4] ایضاً: ص8۔

مندرجہ بالا بحث اس بات کو منہ بولتا ثبوت ہے کہ مولانا رومؒ نے جن حالات میں پرورش پائی ۔وہ انتہائی نازک موڑ تھا لیکن مولانا رومؒ کی شخصیت پر اس کا اثر نہیں ہوا۔وہ انتہائی پر امن شخصیت کے مالک تھے۔اور انہوں کے اپنی شاعری سے دوسروں کو بھی اسی بات کا حکم دیا۔مولانا اپنے والد کے ساتھ ہجرت کرتے ہوئے ہی پلے بڑے اور دوران گردش و قیام اساتذہ سے تربیت پائی۔اور پھر پوری دنیا کو امن و محبت اور رواداری کا پیغام دیا مثنوی معنوی کی صورت میں جس سے لاکھوں دل منور ہوئے۔

فصل دوم: بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کے دور کا ماحول

بابا فرید الدین گنج شکرؒ جس دور میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے۔ عالم اسلام کا ہی نہیں بلکہ پورے ایک تمدن کی تباہی کا دور تھا۔ تاتاریوں کے مشرق پر حملوں نے مسلمانوں کو بہت کمزور کر دیا تھا۔ ملک گیری اور اس کی ترقی کو شدید نقصان ہوا۔ ہندوستان میں غوری حکومت تھی اور شہاب الدین غوری کی تلوار مسلسل بت پرستوں کے لیے نیام سے باہر تھی۔ ہندوؤں کی سازشیں الگ اور سیاسی طور پر الگ مسائل تھے مگر اس نے بہت ہمت سے ان کو اپنے انجام تک پہنچایا۔ اسی طرح حکومت کے مختلف ادوار آتے گئے۔ اور حکمران برسر اقتدار ہوتے گئے۔ چند حکمران نااہل بھی تھے لیکن وہ جلد ہی تخت سے ہٹا دیے جاتے اور جو اس کے اہل ہوتا وہی پایہ تخت کو سنبھالتا اور ایک منظم طریقے سے حکومت کرتا۔ اسی وجہ سے ہندوستان میں سیاسی اور معاشرتی طور پر لوگ بہتر زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن مذہبی طور پر ہندوستان کا ماحول دو مختلف مذہبوں میں پروان چڑھ رہا تھا۔

لیکن سلاطین نے ہندوؤں کو مذہبی آزادی دی ہوئی تھی وہ آزادی کے ساتھ اپنی مذہبی رسومات ادا کرتے تھے۔ لیکن ان میں ذات پات میں فرق، معاشرتی اور مذہبی لحاظ یہ بات کسی طرح بھی ماحول کے لیے بہتر نہ تھی۔ بہر حال سلاطین نے ملک میں قوانین اسلامی ہی نافذ کیے ہوئے تھے۔ مثلاً ٹیکس شرع کے مطابق تھے، سزائیں شرع کے مطابق تھی بلاوجہ کوئی کسی پر ظلم نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت کے سلاطین کا صوفیا سے بہت گہرا لگاؤ تھا۔ صوفیا جو دین کی باتیں بتاتے تھے۔ حکمران ان پر خود بھی عمل کرتے تھے اور عوام کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے مسلمان تو مسلمان ہندو بھی ان صوفیا کی خانقاہوں پر آنے لگے تھے اور نبی کریم ﷺ کی تعلیمات سے مستفید ہو کر اسلام کے دائرے میں آنا شروع ہو گئے جو اسلام کی اشاعت کا سبب بنا۔

بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے دور کے حالات

بارھویں صدی عیسوی منگولوں کے حملے کی صدی تھی۔ یہ تاتاری[1] جو شمالی ترکستان کے رہنے والے خانہ بدوش کی نسل میں سے تھے۔ انہوں نے اُن ممالک میں تباہی مچا دی جو بڑے بڑے شہر اور علم کے مراکز

[1] منگولوں کے ایک قبیلے تاتامنگو سے منسوب، جو شمال مشرقی گوبی واقع وسط ایشیا کے رہنے والے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ نام عام منگول قبیلوں کے لیے جن میں چنگیز خان کا قبیلہ بھی شامل ہے، استعمال ہونے لگا۔ ان کا وطن آج کل ترکستان کہا جاتا ہے اور اس کے نواحی علاقے جن پر تاتاریوں نے قبضہ جما لیا تھا۔ تارتری

تھے۔تاتدیوں کے حملے ایک صدی تک جاری رہے اور برابر تباہی مچاتے رہے اور ان کے حملوں کا اہم نقطہ اسلامی ممالک تھے۔ شیخ فریدؒ جس دور میں پیدا ہوئے اور جوان ہوئے ،اُس دور میں عالم اسلام کی بہت بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی تھی۔ان حملوں کے دوران بخارا کے بہادر حکمران جلال الدین،خوارزم شاہ کا پیچھا کرتا ہوا ہندوستان میں سندھ اور ملتان تک آگیا۔خوازرم شاہ نے بھی آخر دم تک تاتدیوں کا مقابلہ کیا۔چنگیز خان نے اس سے آگے آنے کی ہمت نہ کی۔تاتدیوں کے خوف سے دہلی کی سلطنت کافی خوف زدہ تھی اور اس کے دور دراز کے علاقے تاتدیوں کے حملوں کی زد میں تھے، یہ اُس وقت کی بات ہے جب بابا فریدؒ اجودھن کے مقام پر تھے،اور وہاں کے قبائیلیوں میں اللہ کے دین کی خدمات انجام دے رہے تھے۔جب اُوچ اور سندھ نصیر الدین قباچہ کے زیر حکومت تھے۔تب منگولوں نے اُدھر حملے کیے اور یہ بابا فریدؒ کی جوانی کا وقت تھا۔[1]

بابا فریدؒ کی پیدائش کے وقت ہندوستان کے حالات خراب تھے ہر طرف حملے اور بغاوتیں تھی۔ہندوستان میں اُس وقت خاندانِ غلاماں کی حکومت تھی،ہندوستان میں سلاطین کا مذہبی احساس اور شعور مختلف سماجی قوتوں سے بھی متاثر ہوا تھا۔جس دور کے سلاطین کے مذہبی رجحانات کا ذکر ہم نے کرنا ہے اس میں دو روحانی سلسلے ہندوستان میں موجود تھے۔سہر وردیہ اور چشتیہ ،لیکن ان دونوں سلسلوں میں سلاطین کے ساتھ تعلق میں بہت فرق تھا۔سہر وردی بزرگ سلاطین سے میل جول رکھتے تھے اور شاہی مناصب اور جاگیروں کو بھی قبول کر لیتے تھے جبکہ چشتی بزرگوں کا خیال یہ تھا کہ دربار سے تعلق روحانی زندگی کی سعادتوں سے محروم کر دیتا ہے اور اسی وجہ سے وہ حکومتِ وقت سے اپنا دامن بچاتے تھے۔[2]

التمش[3] جس زمانہ میں بغداد میں تھا۔چشتیہ اور سہر وردیہ سلسلوں کے مشاہیر بزرگ وہاں موجود تھے۔اور ساری فضائیں تصوف کے خیالات سے معمور تھیں اس نے ماحول سے متاثر ہو کر اور مذہب سے عوام کے لگاؤ دیکھتے ہوے سلاطین نے عوام سے مطالبہ کیا کہ اُن کی اطاعت اور فرمابرداری کو بھی مذہبی فریضہ سمجھ کر ان کی بھی اطاعت

کہلاتے تھے۔تاتدیوں کی اکثریت آج کل روس اور سائبیریا میں آباد ہے۔ان لوگوں کو تیرہویں صدی کے منگول حملہ آوروں کی اولاد سمجھا جاتا ہے۔روس، ایران اور افغانستان کی سرحدیں جہاں آکر ملتی ہیں۔وہاں تاتدیوں کی کثیر تعداد آباد ہے۔

[1] طالب، **بابا شیخ فرید**، ص44۔

[2] ایضا، ص44۔

[3] شمس الدین اَلتَمِش (وفات: 28اپریل1236ء) سلطنت دہلی کا تیسرا حکمران اور خاندان غلاماں کا تیسرا بادشاہ، جو قطب الدین ایبک کا غلام تھا اور اس نے ہونہار دیکھ کر اسے اپنا داماد بنالیا تھا۔

کریں۔ جہاں تک پرسنل لاء[1] کا تعلق ہے سلاطین دہلی نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو مکمل آزادی دے ہوئی تھی، نہ ان کے قوانین میں خود کوئی دخل اندازی کرتے تھے اور نہ دوسروں کو اس کی اجازت تھی۔ ہندو دارِ سلطنت میں بلا خوف وخطر بتوں کی پوجا کرتے اور دریا میں نہاتے اور ناقوس بجاتے تھے۔ عہد سلطنت میں ہندوؤں کے مذہبی خیالات کی تبلیغ اور اشاعت پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ چودھویں صدی کے آخر میں جو بھکتی تحریک[2] ملک میں پھیلی اور جس طرح ہندو مبلغین نے اپنے خیالات کی ترویج اور اشاعت کی وہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ حکومتِ وقت نے مذہبی خیالات کی نشر واشاعت میں دخل اندازی نہیں کی۔ التمش کے عہد کی عمارتیں بھی اس کے مذہبی احساس وفکر کی ترجمانی کرتی ہیں۔[3]

حوضِ شمسی[4] کی تعمیر میں خاص طور پر مذہبی جذبات کار فرما ہیں۔ اسی کے زمانہ عہد میں دربار میں مجلس ہوتی تھی وعظ، علمی مباحثے، ذکرِ مجلس وغیرہ۔ یہ خود بھی صوم وصلوۃ کا پابند تھا اور سماع سے بھی اس کو لگاو تھا۔ ہندوستان

---

[1] آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ مسلمانان ہند کی ایک حکومتی تنظیم ہے جو سنہ 1972ء میں قائم ہوئی۔ بورڈ کے قیام کا اصل مقصد یہ تھا کہ بھارت میں مسلمانوں کے عائلی قوانین کا تحفظ اور بالخصوص مسلم پرسنل لاء ایکٹ 1937ء کو بدستور نافذ العمل رہنے کے لیے مناسب اور ضروری حکمت عملی اختیار کی جائے۔

[2] بھکتی تحریک کی ابتدا بارہویں صدی میں جنوبی ہند میں ہوئی تھی۔ اس کے بانی سوامی رامانج، مادھو، آنند تیرتھ، وشنو سوامی اور باسو تھے۔ بھکتی تحریک کے بانیوں نے خدا اور انسان سے پریم کا پرچار بڑے خلوص سے کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ذات پات کا فرق، چھوت چھات، پوجا پاٹ اور طبقاتی اونچ نیچ پنڈتوں اور مولویوں کے ڈھونگ ہیں۔ لوگ اگر پریم کے پرستار ہو جائیں اور دکھاوے کی رسموں کو ترک کر دیں تو خدا اور انسان کے درمیان میں سے حجابات اٹھ جائیں گے۔

[3] منہاج سراج، **طبقاتِ ناصری**، مترجم، غلام رسول مہر (لاہور: مرکزی اُردو بورڈ، 1975)، ص270

[4] اس کے بارے میں ''آثار الصنادید'' میں ہے: ''قطب صاحب کے نواح میں سلطان شمس الدین التمش نے قریب 627 ہجری مطابق 1229 عیسوی کے یہ حوض بنایا تھا۔ مشہور ہے کہ یہ حوض سنگ سرخ کا بنا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں ایک تاریخی واقعے کا ذکر ضروری ہے جس کا بیان تاریخ کی مختلف کتابوں میں ملتا ہے اور اب بھی اس کے پاس ایک پتھر پر یہ واقعہ رقم ہے شہر میں پانی کی قلت تھی اور مہرولی کا علاقہ جمنا سے خاصی دوری پر ہے جس کے سبب جمنا سے استفادہ مشکل تھا۔ ویسے بھی یہ علاقہ پہاڑی کے اوپر آباد ہے اور یہاں کی زمین پتھریلی ہے لہٰذا مشکل ہی سے پانی دستیاب ہوتا تھا۔ سلطان شمس الدین التتمش کو اس مسئلے نے پریشان کر رکھا تھا۔ بادشاہ نے اس بات کا ذکر بزرگ اور صوفی حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ سے کیا۔ بادشاہ نے کئی مقامات پر اس کے لئے کنویں اور تالاب کھدوانے کی کوشش بھی کی مگر پانی نہیں نکل پایا۔ آخر کار ایک روز جب کہ باشادہ سویا ہوا تھا اس نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑے پر سوار تشریف لائے ہیں اور آپ کے گھوڑے نے ایک مقام پر کھر مارے اور وہاں سے پانی ابلنے لگا۔ اس خواب کے بعد بادشاہ اس مقام کی طرف پڑا جہاں اس نے گھوڑے کو کھر مارتے ہوئے خواب میں دیکھا تھا۔ اسی مقام کے قریب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی بھی مل گئے جنھوں نے ٹھیک یہی خواب دیکھا تھا اور نیند سے بیدار ہونے کے بعد اس مقام کی جانب چلے آئے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ گھوڑے کے کھر کا نشان یہاں زمین پر موجود تھا اور جب یہاں کھدائی کی گئی تو پانی نکل آیا۔ مزید تفصیل کے لیے،

میں جو بھی جنگیں لڑی گئیں تھی۔اُن میں جہاد کا جذبہ نمایاں تھا۔اور وہ خالصتا مذہبی مقاصد کے تخت لڑی گئی،اور جگہ جگہ مسجدیں بنائی گئی۔سلطان غیاث الدین بلبن[1]تک جو حکمران خاندانِ غلاماں میں سے بر سر اقتدار آتے رہے اُن سب نے مذہبی مقاصد اور نظریات کو سرِ فہرست رکھا اور خود بھی وہ اسلام کے اصولوں پر پابندی سے کار فرما تھے اور اس معاملے میں عوام پر بھی سختی کرتے تھے۔لیکن بلبن بعض اوقات غیر شرعی حرکات کو جائز ثابت کرنے کے لیے اپنے آپ کو دھوکا دیتا تھا کہ ان تمام باتوں سے امر بالمعروف میں مدد ملتی ہے۔مذہبی لحاظ سے اس کے اندر ایک اور بات جو نا مناسب تھی وہ یہ کہ فخر نسب اور غرور خاندان کے جذبات بھی نمایاں تھے،اور حسب و نسب پر زور دیا جانے لگا۔بلبن کا غرور نسب کے ساتھ ساتھ کم نسل لوگوں کی جو تذلیل ہوتی تھی۔وہ مذہبی اور اخلاقی کسی بھی نقطہ نظر سے جائز نہیں ہو سکتی۔ہندوستان میں بیشتر سلاطین اور عوام فقہ حنفی پر تھے۔غوریوں نے سب سے پہلے ہندوستان میں جس سیاسی طاقت پر تلوار چلائی وہ غزنویوں کی تھی۔جب ہندو راجاؤں سے جنگ ہوئی تو سیاسی مصلحتیں جو راہ دکھاتی رہیں اُن پر عمل ہوتا رہا،اجمیر فتح ہونے کے بعد کافی مدت تک اس کی نگرانی اس کے بیٹے کے پاس رہی،یہی عمل گوالیار کے راجہ کے ساتھ کیا گیا۔جب اُس نے شہاب الدین کا اقتدار تسلیم کر لیا تو اس کو ہی رہنے دیا گیا اگر ان جنگوں کا مقصد اسلام کی سربلندی ہوتا تو،اسی وقت ان ہندو حکمرانوں کو ہٹا کر مسلمان حکمرانوں کو حکومت دے دی جاتی۔[2]

1174ء میں سلطان معزالدین[3] نے اپنے دادا غیاث الدین کی نیابت میں غزنی کی حکومت پائی،اور ایک سال کے بعد اس نے اُوچ اور ملتان کی طرف رُخ کیا اور قرامطہ کے قبضہ سے نکال کر فتح کیا۔سلطان نے ملتان اور اُوچ کو علی کرماخ کے حوالے کیا اور خود واپس آ گیا۔سلطان معزالدین پھر ہندوستان کی طرف گیا،اور اسی مقام پر جہاں پہلے جنگ ہوئی تھی۔پتھوار سے مقابلہ کیا اور پھر فتح ہوئی،پتھوار کو قید کیا اور مار دیا۔1193ء ہانسی اور اجمیر کو جو پتھوار

---

https://www.urdu.awazthevoice.in/india-news/the-slave-who-became-the-king-of-india-10897.html

[1] غیاث الدین بلبن خاندان غلاماں کا آٹھواں سلطان تھا۔اس نے اپنے دور حکومت میں امرا اور سرداروں کا زور توڑ کر مرکزی حکومت کو مضبوط کیا۔بغاوتوں کو سختی سے کچل کر ملک میں امن وامان قائم کیا اور سلطنت کو تاتاریوں کے حملے سے بچایا۔بڑا مدبر،بہادر اور منصف مزاج بادشاہ تھا۔علما و فضلا کا قدر دان تھا۔اس کے عہد میں شراب کی خرید و فروخت اور راگ رنگ کی محفلوں کے انعقاد کی اجازت نہ تھی۔انصاف کرتے وقت ہندو مسلم اور غریب اور امیر کی تمیز روا نہ رکھتا تھا۔مجرموں کو سخت سزائیں دیتا۔لیکن رعایا کے لیے بڑا فیاض اور روشن خیال تھے۔

[2] منہاج سراج، **طبقاتِ ناصری**،ص282۔

[3] معزالدین کیقباد (کے قباد پڑ) (1286ء تا 1290ء) سلطنت دہلی کا دسواں سلطان تھا جو خاندان غلاماں سے تعلق رکھتا تھا۔وہ غیاث الدین بلبن (1266ء تا 1286ء) کا پوتا تھا۔

کے ماتحت تھا۔ قطب الدین ایبک کے سپرد کیا اور خود دہلی آگیا، اس نے مزید جنگیں کیں اور ان علاقوں کو فتح کیا۔ دہلی کو دار الحکومت بنایا اور وہیں قیام کیا، اور دہلی کے اطراف پر قبضہ کر لیا، اور اپنی حکومت کو مضبوط کر لیا، اور لاہور میں بہت سے ایسے ٹیکس ختم کر لیے جو غیر شرعی تھے، اور حکم دیا کہ مسلمانوں سے غیر شرعی خراج کے بجائے شرعی ٹیکس یعنی عُشر لیا جائے۔ چار سال حکومت کرنے کے بعد جب التمش کا دور حکومت آیا تو اس نے بھی وہی اصول اپنائے جو سابقہ حکمرانوں کے تھے۔ عدل وانصاف اور رعایا کے ساتھ بہترین سلوک کیا۔ سیاسی معاملات میں سلاطین کا رجحان بالکل سیاسی مفاد کے عین مطابق ہوتا تھا، اور اس صورت میں مذہبی اصولوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی جاتی تھی۔[1]

دورِ سلطنت میں حکومت کی پالیسی اور اسکا طریقہ کار بادشاہ متعین کرتا تھا۔ دیوان قضا جہاں بیشتر علماء کا دخل ہوتا تھا مگر وہاں علماء اپنی مرضی سے اس میں کوئی مشورہ نہیں دے سکتے تھے۔ علماء نے اگر کبھی سیاست میں حصہ لیا بھی تو مذہبی حیثیت سے نہیں بلکہ سیاسی کارکن کی حیثیت سے حصہ لیتے تھے۔ مگر اس نے چشتیہ بزرگوں کی تعلیمات سے اس بات کو اپنے اوپر لازم کر لیا کہ تلوار اور خون بہا سے وہ کام نہیں ہو سکتا جو پیار و محبت سے ہو سکتا ہے۔
ہندوستان کے اس خاموش اشارے کو سمجھ لیا، اور ہمدردانہ اور مصلحانہ طرزِ فکر کی مدد سے ایک مضبوط سیاسی نظام کی بنیادیں قائم کیں۔ تاتدیوں کے حملوں کے خوف سے حکومت اور عوام دونوں پریشان تھے۔ 1242ء میں لاہور پر منگولوں نے حملہ کر دیا۔

جہاں پر مذہبی اور سیاسی طور پر چند ایک خامیاں تھی۔ ہندوستان کے معاشرے میں وہاں معاشرتی طور بھی چند کمیاں موجود تھی۔ ہندوستان میں کیونکہ آبادی کا زیادہ تر حصہ ہندوؤں پر مشتمل تھا۔ اس لیے وہاں پر دو طرح کی قومیں آباد تھی۔ ہر ایک کا اپنا طریقہ تھا رہنے کا، اور اپنے رسم و رواج تھے۔ ہندوستان طبقاتی امتیازات اور چھوت چھات کے مہلک تصورات میں اُلجھا ہوا تھا۔ اعلیٰ طبقے شہروں میں رہتے تھے، اور پورا سماجی و معاشرتی نظام اُن کی لیے تھا۔ اور زندگی کی تمام تر سہولتیں ان کو میسر تھی۔ چھوٹے طبقے کے لوگ شہر سے باہر رہتے تھے۔ اور اُن کے لیے صرف زندگی کی مشکلیں اور سختیاں تھی۔ شہر کی چار دیواری میں وہ لوگ طلوعِ آفتاب کے بعد آسکتے تھے، اور غروبِ آفتاب سے پہلے واپس اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے۔ ایک ہی جرم کے لیے مختلف سزائیں تھی، اعلیٰ طبقوں کے لیے اور، اور چھوٹے

[1] منہاج سراج، **طبقاتِ ناصری**، ص283۔

طبقوں کے لیے اور سزا تھی۔ نچلی ذات والوں کے لیے ہر کام میں مشکل ہوتی تھی۔ اس ذات پات کے فرق نے اور بہت سی برائیوں کو معاشرے میں جنم دے دیا تھا۔ جس کی وجہ سے ہندوستان کا معاشرتی نظام کافی حد تک درست کرنے کی ضرورت تھی۔[1]

مندرجہ بالا حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بابا فرید گنج شکرؒ نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی اس وقت مذہبی، سیاسی اور معاشرتی حالات میں کچھ خامیاں تھی۔ ہندوستان میں کیونکہ چشتیہ سلسلہ مسلمان حکمرانوں کی آمد کے ساتھ ہی آگیا تھا۔ اس لیے ان بزرگوں کا احترام اور ان کی تعلیمات کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ سلاطین کے ہاں ان کی بہت قدر تھی، اور بابا فریدؒ کی ہی تعلیمات کا اثر تھا۔ جو ہندوستانی معاشرے سے برائیاں ختم کرنے کا ذریعہ بنا۔ جس نے تمام انسانیت کے ساتھ مساوات کے ساتھ رہنے کا درس دیا، اور امن و محبت کا درس دیا۔ جس نے اُن تعلیمات کو دوبارہ یاد کروایا۔ جو نبی کریم ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر بتائی تھی، تم سب آدم کی اولاد ہو، تم میں سے کسی کو کسی پر کوئی فصلیت حاصل نہیں مگر تقویٰ کی بنیاد پر، اور جس طرح نبی کریم ﷺ نے کفار کے ساتھ بھی نرمی کا برتاو کر کے ان کے دلوں کو اسلام کی طرف راغب کیا، اسی طرح بابا فریدؒ نے بھی ہندووں معاشرے میں اسلام کی تبلیغ کی، اور ان تعلیمات کو بنیاد بنا کر جو نبی کریم ﷺ نے چودہ سو سال پہلے بتادی تھی۔ اس ہندوں معاشرے کی اصلاح کی۔

مولانا جلال الدین رومیؒ کے دور کے حالات

سلجوقی سلطنت 11 ویں صدی اور اسکے بعد مشرق وسطیٰ اور وسط ایشیا میں قائم ایک مسلم بادشاہت تھی۔ جو نسلا ویغور ترک تھے۔ مسلم تاریخ میں اس کو بہت اہمیت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، کیونکہ یہ دولت عباسیہ کے خاتمے کے بعد عالم اسلام کو ایک مرکز پر جمع کرنے میں اس حکومت کا بہت اہم کردار ہے۔ لیکن اس سے پہلے ساتویں صدی میں عالم اسلام کو وہ حادثہ پیش آیا جس کا نقصان کبھی پورا نہیں کیا جاسکتا۔ وہ تھا تاتاریوں کے عالم اسلام پر حملے اور اس کا سبب بنا سلطانِ وقت علاؤالدین محمد خوارزم شاہ کی ایک غلطی جس نے چنگیز خان کی وحشی قوم کو حملے کی دعوت

[1] نظامی، خلیق احمد، **سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات**، (دہلی: مطبوعہ الجمعیۃ پریس، 1958)، ص 164۔

دی کہ وہ اسلامی ممالک کو تباہ و برباد کر دے۔ مولانا روم 604ھ میں پیدا ہوئے اور 610ھ میں انہوں نے بلخ کو چھوڑ دیا، اس وقت مولانا کی عمر صرف چھ سال تھی۔ وہ اپنے والد کے ساتھ آ گئے۔

بلخ میں اس وقت سلطان علاؤالدین محمد تخت نشین تھا۔ مولانا کے آباؤاجداد کی ہجرت کے دو اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس وقت کے علماء ان کے والد گرامی سے حسد کرتے تھے۔ دوسرا یہ کہ منگولوں کے حملوں کی نشاندہی ہو رہی تھی۔ جس کی وجہ سے مولانا کے آباؤاجداد کو بلخ کو خیر آباد کہنا پڑا۔[1]

مولانا نے اپنی زندگی سلجوقی حکمرانوں کے دورِ حکومت میں گزاری اور اس وقت کے سیاسی حالات بظاہر تو اچھے معلوم ہوتے ہیں مگر اندرونِ خانہ حالات خراب تھے۔ سلجوق روم گیارہویں صدی کے آخر تک قیام رہی اور اس کا پایہ تخت قونیہ میں تھا، یہاں کا حاکم غیاث الدین اول تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا تخت پر آیا اور اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہا ۔ مگر ایک دوسرے کے خلاف سازشوں کا جال بننا اور قتل کروا کے خود تخت پر آنا یہ عام سی بات ہو چکی تھی۔ لیکن جو بھی اقتدار میں آتا حکومت کے قوانین اسلام کے مطابق نافذ کرتا اور اسی وجہ سے سلجوق کے اس خاندان نے تمام سلسلوں کے مقابلے میں زیادہ عرصے تک حکمرانی کی ان پر ہی سلاجقہ کی نسل اور سلطنت کا خاتمہ ہوا۔[2]

انھوں نے اپنے دورِ حکومت میں روم کے مختلف شہروں میں بہت سی عمارتیں بنائیں، مساجد اور مقابر کی تعمیر اس دورِ حکومت کے اہم کاموں میں سے ہیں۔ جب بھی کوئی شہر فتح ہوتا تو، تمام ذخائر و اموال کا معائنہ کیا جاتا، اور جو چیزیں کم یا گم ہوتی ان کو پورا کیا جاتا پھر فصیل کی مرمت کی جاتی۔ تاکہ دوسرے شہروں کی فتح میں یہ مددگار ثابت ہو۔ اس کے علاوہ خائنوں کے اموال و املاک کو خزانہ خاص میں منتقل کر دیا جاتا اور ان کو دیوانِ اعلیٰ کے حسابات میں درج کر کے بعض جاگیروں اور اقطاعات میں اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ اگر کسی بڑے سے بڑے لشکر سے کوئی چھوٹی سی غلطی ہو جاتی تو اسے سخت سے سخت سزا دی جاتی۔ تاکہ آئندہ کوئی غلطی نہ کرے۔ انصاف میں سب کے ساتھ یکساں سلوک رکھتا تھا۔ خزانہ کے حساب لیتا اور مصارف میں افراط و تفریط دیکھتا تو سختی کرتا اور مہمانوں اور اطراف کے ایلچیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا۔ سلطنتِ سلجوق کے ہاں حکومت کے ساتھ غداری کرنے والوں کی کوئی جگہ نہ تھی۔ سزاوں پر حکم شرعی کے مطابق عمل کیا جاتا تھا۔ جن شہروں پر کوئی ظالم حکمران مسلط ہوتا ان پر لشکر کشی کر کے

---

[1] خاں، **افکارِ رومی**، ص45۔

[2] نصیر الدین یحیٰ المعروف بابن بی بی، **سلجوق نامہ**، مترجم، محمد زکریا مائل، (لاہور: مرکزی اُردو بورڈ، 1975)، ص221۔

فتح کے بعد وہاں دفتر قائم کیے جاتے، جائیدادوں وغیرہ کا حساب لکھ کر وہاں کے مقیمین کے لیے رہنے کا بندوبست کیا جاتا۔ اگر رعایا میں سے کسی کی کوئی چیز گم ہو جاتی اور سامنے ہونے کے باوجود اس کو کوئی خود نہیں اُٹھا سکتا تھا، بلکہ جو فرد اس کام پر مامور ہوتا وہ اس کو بارگاہ سلطنت میں لے جاتا منادی کرادی جاتی، اس کے بعد جو مالک ہوتا وہ گواہ پیش کر کے اپنی چیز لے جاتا۔ جہاد کی ترغیب دے کر لوگوں کو کفار کے مقابل لایا جاتا اور جو مالِ غنیمت حاصل ہوتا اس کا خمسِ خاص نکلنے کے بعد تقسیم کر دیا جاتا۔[1]

سلجوقی سلطنت کے بادشاہوں نے جب عیش و عشرت کو اپنا شعار بنایا، اور اللہ اور رسول ﷺ کے احکامات کی نافرمانی کی تو ان کی حکومت زوال پذیر ہونے لگی۔ اقتدار کی اس ذاتی ہوس نے عوام کا خون پانی کی طرح بہا دیا، دولت لوٹی جا رہی تھی۔ سابق حاکم اور امیر قتل کر دیے جاتے۔ نئے نئے لوگ اقتدار میں آ رہے تھے۔ ان میں نااہل اور ناکارہ لوگ بھی تھے، اور عیش پسند بھی جن کی وجہ سے حکومت پستی کا شکار ہو گئی۔ سلطان و امراء تو صوم و صلوۃ کے پابند تھے ۔ لیکن جب حکومت ناکارہ اور عیش پسند لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی تو سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ مذہبی زوال بھی شروع ہو گیا۔

لیکن وقت کی ضرورت یہ تھی کہ روحانی اقتدار کی طرف رجحان ہو، اور روحانی طمانیت حاصل ہو۔ شاہی بارگاہیں فتنہ فساد سے خالی نہ تھی مگر فقیروں کی درگاہیں امن و شانتی کا گوشہ تھی، پھر وہی عام و خاص کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ بزرگوں اور صوفیا کی صحبت سے مستفید ہونا اس وقت کی اہم ضرورت تھی، ابنِ عربی[2] اور فرید الدین عطار جیسے کثیر صاحبان ارشاد اور تصوف وقت کے اسی باطنی تقاضے کا جواب تھے۔ یہ صوفیا منتشر لوگوں کو جمع کرنے اور ان کی روح کو پھر سے زندہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس زمانے کے صوفیا نے مسلمانوں کی سیاسی اور دینی تباہی کے درد ناک منظر دیکھے تھے، ان حالات کا اُن پر گہرا اثر ہوا صوفیا نے مسلمانوں کے ذہنی انتشار کو دور کرنے کے لیے سلاسل کی تنظیم شروع کر دی، ان سلسلوں کے عروج سے اسلامی سوسائٹی کو جو فائدہ ہوا وہ یہ کہ مسلمانوں کی پریشانی میں کمی ہوئی۔ اسلامی دنیا کا کوئی ایسا کونہ، نہیں تھا، جہاں خانقاہیں قائم نہ کی گئی ہو اور جہاں عوام کی اصلاح و تربیت کا انتظام نہ کیا

---

[1] نصیر الدین یحیٰ المعروف بابن بی بی، **سلجوق نامہ**، ص223

[2] محی الدین محمد ابن العربی الحاتمی الطائی الاندلسی (1240ء—1165ء) دنیائے اسلام کے ممتاز صوفی، عارف، محقق، قدوہ علما اور علوم کا بحر بیکنار ہیں۔ اسلامی تصوف میں آپ کو شیخ اکبر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور تمام مشائخ آپ کے اس مقام پر تمکین کے قائل ہیں۔

گیا ہو۔ جو قوم مذہبی طور پر پستی کا شکار ہو چکی تھی۔ اسکو تصوف کے ذریعے دوبارہ عروج پر لایا گیا۔ زندگی کی یہ نئی لہر تین طاقتوں کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ، انفرادی زندگی کو اجتماعی زندگی کے لیے قربان کر دینے کا جذبہ اور اخلاقی اقدار کو زندہ کرنے کا عزم۔[1]

ساتویں صدی کا بڑا حصہ مولانا کا عہد ہے، اور ساتویں صدی مسلم اُمہ کے لیے سخت آزمائشوں کا دور تھا۔ جان، مال اور عزت کوئی چیز محفوظ نہ تھی۔ ہر عام و خاص حتی کہ پورا مسلم معاشرہ بے چارگی، مایوسی، بے یقینی اور خوف و ہراس کا شکار تھا۔ طوائف الملوکی، جنگ و جدل تو تھی ہی، سب نے معاشرے کو اخلاقی لحاظ سے بہت پست کر دیا تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات ایک آفت تھی۔ ایک ہی قوم اور ایک ہی آبادی کے لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن چکے تھے۔ مشرق میں تاتاریوں کے حملے اور مغرب میں صلیبی جنگیں ہر طرف خون ریزی ہی خون ریزی تھی۔ ارضی اور سماوی آفات بھی مسلمانوں پر رحم نہیں کھا رہی تھی۔ ایک کے بعد ایک مصیبت آگھیرتی تھی۔[2] قحط نے علاقے کے علاقے تباہ کر دیئے لوگ انسانوں تک کو کھانے لگ گئے۔ وباؤں نے آبادیوں کی آبادیاں ختم کر دی۔ زلزلوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ ہر طرف لوٹ مار اور قتل و غارت تھی۔

صنعت و حرفت اور تجارت تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ بغداد جیسا بارونق شہر ویران ہو گیا، جہاں تاجروں کا ہجوم لگا رہتا تھا، وہاں جگہیں ویران تھی۔ تاتاریوں نے پہلے بخارا کو تباہی کے عروج پر پہنچایا، اور شہر کی آبادی سے کوئی زندہ نہ رہا۔ یہی حال ارد گرد کے شہروں کا کیا۔[3]

656ھ میں چنگیز خان[4] کے پوتے ہلاکو خان[5] نے بغداد کی تباہی کی۔ پھر اس کے بعد حلب کی طرف رُخ کیا اور اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا۔ وہاں سے دمشق کی طرف بڑھا، جمادی الاولیٰ 658ء میں اس پر قبضہ کر لیا۔ اس

---

[1] نصیر الدین یحیٰ المعروف بابن بی بی، **سلجوق نامہ**، ص228۔

[2] خاں، **افکارِ رومی**، ص11۔

[3] ایضا، ص13۔

[4] چنگیز خان ایک منگول سردار تھا جس کا اصلی نام تموجن تھا جس کا مطلب ہے "فولاد جیسا مضبوط"۔

[5] ہلاکو خان (پیدائش 15 اکتوبر 1218ء—وفات 8 فروری 1265ء) ایل خانی حکومت کا بانی اور منگول حکمران چنگیز خان کا پوتا تھا۔ ایران میں اسماعیلیوں کا زور توڑنے کے بعد ہلاکو خان نے بغداد کا رخ کیا جو اس زمانے میں شیعہ سنی فساد کا گڑھ بنا ہوا تھا خلیفہ مستعصم باللہ کے شیعہ وزیر ابن علقمی نے ہلاکو خان سے ساز باز کر کے ہلاکو کو بغداد پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ 1258ء میں بغداد تباہ کرنے کے بعد ہلاکو خان نے پورے عراق پر قبضہ کر لیا اور بصرہ اور کوفہ کے عظیم شہر تباہ و برباد کر دیے۔

بگڑتی ہوئی ملکی حالت میں زندگی کے ہر شعبہ کا نظام خراب تھا۔ لیکن معاشرتی حالت بہت حد تک تشویش ناک ہو چکی تھی۔ شہر تباہ ہوتے تھے، تو اس شہر کی ہر چیز تباہ و برباد ہو جاتی تھی۔ اور وہاں کے باشندے چوری اور قتل کر کے سامان حاصل کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اموال و دولت سب برباد ہو گئے، جس کی وجہ سے مفلسی عام ہو گئی، لوگ ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو گئے، اتفاقی ختم ہو گئی۔ روزگار کا نظام بھی تباہ ہو چکا تھا۔ لوگ فاقوں پر مجبور ہو گئے۔ جس کی وجہ سے معاشرہ بدامنی کا شکار ہو گیا، اور بہت سی خرابیاں معاشرے میں جنم لینے لگی۔[1]

مندرجہ بالا حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہیں، کہ مولانا روم نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی اور پروان چڑھے، اس وقت سیاسی، مذہبی اور معاشرتی حالات کا نہایت نازک دور تھا۔ کیونکہ اس وقت حکمران عیش پرست ہو چکے تھے۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا زوال منگولوں کے حملے کا نتیجہ تھا۔ لیکن اصل میں منگولوں کے حملے مسلمانوں کے زوال کا نتیجہ تھے، سبب نہیں۔ اور سیاسی، مذہبی اور معاشرتی زوال سے پہلے اخلاقی زوال کی تمام منزلیں طے ہو چکی ہوتی ہیں۔ اس طرح کے حالات میں صوفیا نے مسلمانوں کی ذہنی نشوونما میں اہم کردار ادا کیا۔ ابنِ عربی، فرید الدین عطار جن سے مولانا نے بھی فیض حاصل کیا۔ ان بزرگوں نے مسلمانوں کی رُوح کی تازگی کا بندوبست کیا۔ ہر شہر میں خانقاہیں بنوائی اور نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کو پھر سے لوگوں کے ذہنوں میں تازہ کیا، اور ان تعلیمات کو اپنا شعار بنا کر زندگی کے تمام پہلو کو گزرا جائے۔ خاص طور پر سیاسی اور مذہبی امور میں نبی کریم ﷺ کے اسوہ حُسنہ کو سامنے رکھتے ہوئے تمام فیصلوں کو سرانجام دیا جائے۔ تاکہ عوام اور حکمران دونوں جہاں میں کامیاب ہو سکے۔

[1] بیگ، عبدالباقی، **جہانِ رومی**، (نئی دہلی: پبلی کیشنز حکومت ہند، 2009) ص 9۔

باب دوم

اسلام میں امن اور رواداری کے اصول و آداب اور اہمیت

فصل اول: اسلام میں امن اور رواداری کا مفہوم اور ضرورت و اہمیت

فصل دوم: نبی کریم ﷺ کے غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات اور رواداری

فصل سوم: اسلام میں رواداری کے اصول و آداب

باب دوم: اسلام میں امن اور رواداری کے اصول و آداب اور اہمیت

تمہید:

مسلمان ہونے کے ناطے ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ہر انسان معزز و مکرم ہے، خواہ اس کا تعلق کسی بھی ملک یا دین سے ہو۔ اللہ پاک قرآن کریم میں انسان کی فضیلت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي اٰدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴾[1]

ترجمہ: اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی ہے اور خشکی اور دریا میں اسے سوار کیا اور ہم نے انہیں ستھری چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر انہیں فضیلت عطا کی۔

اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کو عزت اور تکریم سے نوازا ہے تو ہمیں بھی چاہیے کہ ہم تمام انسانوں کو عزت دیں۔ اگر اللہ چاہتا تو سب کو مسلمان بنا دیتا لیکن یہ اس کی مرضی اور حکمت ہے کہ کوئی مسلم ہے اور کوئی غیر مسلم ہے۔

﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ﴾[2]

ترجمہ: تیرا رب چاہتا تو تمام انسان کو ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ سب الگ الگ ہیں۔

اس لیے اس بات کا اللہ تعالیٰ نے کسی کو حق نہیں دیا کہ وہ زبردستی مسلمان بنائے۔

﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴾[3]

ترجمہ: تمہارا رب چاہتا تو زمین کے سارے لوگ ایمان لے آتے۔ کیا تم لوگوں کے ساتھ زور زبردستی کرنا چاہتے ہو تاکہ وہ ایمان لے آئیں۔

---

[1] الاسرا:70۔

[2] ھود:118۔

[3] یونس:99۔

کسی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی کافر کے کفر کا محاسبہ کریں اور اس کو سزا کی وعید سنائے بلکہ یہ کام اللہ کا ہے اور اللہ پاک نے اس کام کے لیے جزاء اور سزا کا نظام بنایا ہوا ہے۔ اس لیے وہ بندوں کو حکم دیتا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ عدل وانصاف، مساوات، رواداری اور بہترین اخلاق حمیدہ اپنائے جائیں۔ اللہ تعالیٰ ظلم وزیادتی کی تعلیم نہیں دیتا، خواہ معاملہ کافروں کے ساتھ ہو یا مسلمان کے ساتھ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی راہنمائی کے لیے انبیاء کرام اور رسل مبعوث کیے اور خود اُن کی تربیت کی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس کا حکم نہیں دیا کہ وہ اس کے بنائے ہوئے قانون میں دخل اندازی کریں۔ اس کے قانون کے مطابق اس کائنات میں ہر ایک صاحبِ ایمان نہیں اور نہ کسی کو یہ کام کرنے کی ذمہ داری کسی کو سونپی ہے۔ بلکہ اس نے جو حکم اپنے بندوں تک پہنچانا تھا، اس کے لیے اُس نے اپنے مخصوص بندوں کا انتخاب کیا اور اُن نے وہ امور نہ صرف لوگوں تک پہنچائے بلکہ ان کا عملی نمونہ بھی پیش کیا۔

اسلام میں رواداری کا جو مفہوم واضح کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ دوسروں کے مذہبی عقائد کا احترام کرتے ہوئے اُن کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں۔ اُن کے مذہب میں جو عبادات ورسومات ہیں ان کا اُسی طرح احترام کریں جس طرح ہم اپنی مذہبی رسومات کا احترام کرتے ہیں چاہے ہم ان کے عقائد سے متفق ہوں یا نہ ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم ان کے مذہب کو تسلیم کرلے اور ان کے غلط عقائد اور نظریات کو درست مانتے ہوئے خاموشی اختیار کرلیں؟ جی نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم ان کے مذہب کو درست مان کے خاموشی اختیار کرلیں۔ بلکہ اس جگہ ہمیں وہ طریقہ اختیار کرنا ہوگا جو نبی کریم ﷺ نے اختیار کیا۔ ہمیں احسن طریقے سے اپنے دین کی تبلیغ کرنی ہوگی اور بہتر اخلاق اپنانے ہوگئے۔ جس سے غیر مسلم متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی زندگی ہمارے لیے ایک عمدہ مثال کے طور پر چھوڑی ہے۔ آپ ﷺ کی زندگی کے ہر پہلو میں ایک مکمل اور قرآن مجید کے مطابق سبق ملتا ہے۔ آپ ﷺ نے غیر مسلموں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا، اس کی مثال دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملتی۔ نبی کریم ﷺ نے غیر مسلموں کے ساتھ جو معاہدے طے کیے ان کو پورا کیا، کچھ ان کی باتوں کو مان کے اور کچھ اپنی باتوں کو منوا کے معاشرے میں رواداری کی مثال قائم کی اور معاشرے میں امن وامان کی فضا بحال کی۔ نبی کریم ﷺ نے ایک اللہ کی عبادت کرنے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانے کی تبلیغ

دیتے ہوئے، غیر مسلموں کو اس چیز کی بھی اجازت دی کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق عبادت کریں اور آزادی کے ساتھ زندگی بسر کریں۔

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾[1]

آپ فرمادیں: اے اہلِ کتاب! تم اس بات کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، (وہ یہ) کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے اور ہم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب نہیں بنائے گا، پھر اگر وہ رو گردانی کریں تو کہہ دو کہ گواہ ہو جاؤ کہ ہم تو اللہ کے تابع فرمان (مسلمان) ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے جو معاہدے کیے ان میں مذہبی رسومات کا احترام کرتے اور ان پر اُن کے مذہب کے معاملے میں کوئی سختی نہ کرتے اور نہ کسی کو سختی کرنے دیتے۔ اسلام نے ہر ایک چیز کی ایک حد مقرر کی ہے، کیونکہ ہر ایک چیز میں اعتدال اور میانہ روی اچھی لگتی ہے۔

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾[2]

اور اسی طرح ہم نے تمہیں بہترین امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ ہوں۔

غیر مسلموں کے ساتھ معاملات میں بھی ایک حد مقرر کی ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مقرر کی اور ہمیں اس پر کاربند رہنے کا حکم دیا۔

---

[1] آلِ عمران، 64۔

[2] البقرۃ۔143۔

فصل اول: اسلام میں امن اور رواداری کا مفہوم اور ضرورت واہمیت

رواداری ایک اخلاقی صفت ہے۔ جو صاحبِ مروت اور اعلیٰ ظرف لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ ان لوگوں میں صبر اور برداشت کی صلاحیت ہوتی ہے، لہذا ایسے لوگ دوسروں کے ناپسندیدہ افعال کو بھی برداشت کر لیتے ہیں۔ شریعت نے جن اخلاقی اوصاف کی تعلیم دی ہے وہ نہ صرف ایمان وعقیدہ کے ساتھ منسلک ہیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ بھی گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ رواداری بھی ایک ایسی صفت ہے جو صبر و تحمل، عفو ودر گزر، عاجزی وانکساری اور رحم دلی و ہمدردی کے ساتھ جڑی ہے۔ جب تک یہ صفات پیدا نہ ہوں رواداری بھی پیدا نہیں ہوتی۔ جب تک انسان اپنے غصہ پر قابو نہ پائے، بغض، حسد اور کینہ کو ختم نہ کرلے، تب تک وہ رواداری سے بھی محروم رہتا ہے۔ رواداری کے بغیر کوئی بھی معاشرہ امن و سکون سے نہیں رہ سکتا۔ نبی کریم ﷺ نے جب مکہ سے مدینہ ہجرت کی تو وہاں کا ماحول بہت پیچیدہ تھا۔ ہر طرف فتنہ فساد اور لڑائی جھگڑا تھا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے قبائل ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں آکر سب سے پہلے وہاں کے لوگوں کے درمیان امن و رواداری کی بنیادیں ڈالیں اور ان کو مضبوط کیا تاکہ ایک مضبوط اور مستحکم معاشرے کی تشکیل ہو سکے۔ جس طرح رواداری کے بغیر معاشرہ تشکیل نہیں پاسکتا، اس طرح امن کے بغیر بھی معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔

کرہ ارض پر انسانیت کا ظہور انسانیت کی آزمائش کی خاطر تھا اور جب سے انسان اس دنیا کی زینت بنا ہے، اس وقت سے لے کر قیامت تک آزمائشوں کا مقابلہ کرنا اس کے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔ انہی آزمائشوں میں سے ایک آزمائش جنگ وجدال اور بدامنی ہے۔ جو انسانیت کے اطمینان کی قاتل ہے۔ جنگ وجدال اور بدامنی کا تصور کرہ ارض پر روزِ اول سے موجود ہے۔ اس دنیا میں پہلا بدامنی کا واقع اس وقت پیش آیا جب قابیل نے ہابیل کو قتل کیا اور اس کے بعد زمین پر بدامنی کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حالانکہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی ﷺ تک جتنے بھی صحائف و کتب ساویہ نازل ہوئے، ان سب میں امن کا پرچار کیا گیا ہے۔ کیونکہ امن ہی معاشرتی زندگی کے پر سکون ہونے کی ضمانت دیتا ہے۔

امن کا معانی و مفہوم

امن میں چین، اطمینان، سکونِ آرام کے علاوہ صلح و آشتی اور پناہ کے معانی بھی پائے جاتے ہیں۔[1]

اصطلاحی طور پر امن، سماج کی اس کیفیت کا نام ہے جہاں تمام معاملات معمول کے ساتھ بغیر کسی تشدد اختلافات کے چل رہے ہوں[2]۔امن کا تصور کسی بھی معاشرے میں تشدد کی غیر موجودگی یا پھر صحت مند، مثبت بین الاقوامی یا بین الانسانی تعلقات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اس سے معاشرے کے تمام افراد کو سماجی، معاشی اور سیاسی حقوق و تحفظ حاصل ہوتا ہے۔

امن کی عمومی تعریف میں کئی معانی شامل ہوتے ہیں۔ان میں مجموعی طور پر امن کو تحفظ بہتری، آزادی، دفاع، قسمت اور فلاح کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔اصطلاحی معنی میں امن سے مراد تشدد سے خالی ایک ایسی طرز زندگی ہوتا ہے جس کی خصوصیات میں افراد کا ادب، انصاف اور عمدہ نیت مراد لی جاتی ہے۔معاشرے میں انفرادی طور پر امن کی حالت ہر فرد پر یکساں لاگو ہوتی ہے، جبکہ مجموعی طور پر کسی بھی خطے کا پورا معاشرہ مراد لیا جاتا ہے۔[3]

شریف جرجانی کے مطابق امن کی تعریف یہ ہے۔

"هو عدم توقع مكروه فی الزمان الاتی"[4]

ترجمہ: مستقبل میں کسی بھی ناپسندیدہ واقعہ کی توقع نہ کرنا۔

انگریزی زبان کی مشہور عالم لغت آکسفوڈ ڈکشنری میں امن کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

"Freedom from disturbance : tranquility[5]"

ترجمہ: امن سے مراد بے چینی سے نجات اور سکون کا حصول ہے۔

علمائے لغت کی بیان کردہ ان تعریفات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امن سے مراد ایسا ماحول ہے جس میں کوئی انسان بلا خوف و خطر زندگی گزارے۔ جہاں اس کے مفادات کو تحفظ حاصل ہو اور وہ مستقبل کے حالات سے

---

[1] فیروز الدین، مولوی، الحاج، **فیروز اللغات**، فیروز سنسز لمیٹڈ، لاہور، ص122

[2] سعیدا ے شیخ، رابعہ اردو لغت جامع، اسلامک بک سروسز، دریا گنج نئی دہلی، طبع اول 2007، ص110

[3] سیدہ سعدیہ، **"قیام امن اور حیات نبوی ﷺ"**، (لاہور: مقالہ برائے پی-ایچ ڈی، پنجاب یونیورسٹی، 2017) ص94۔

[4] الجرجانی ،الشریف، **کتاب التعریفات** ،المطبعة الخیریة المنشاة جما لیه مصر ،1306ھ،ص16

[5] https://en.oxforddictionaries.com/definition/peace

مطمئن ہو کر اپنے معمولات ادا کر رہا ہو۔ایسا ماحول جہاں اسے مکمل اطمینان حاصل ہو اور اسے کسی بھی معاملہ میں پریشانی کا سامنا نہ ہو۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں امن کی اہمیت:

﴿ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾[1]

ترجمہ: اور جو شخص صبر کرلے اور معاف کر دے یقیناً یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔

امن عالم صرف جنگ و قتال کی عدم موجودگی ہی کا نام نہیں رہ جاتا، بلکہ یہ انسان کی انفرادی معاشرتی، مذہبی و اخلاقی اور بین الاقوامی زندگی میں اطمینان اور بے خوفی کے وسیع مفہوم کو سمیٹے ہوئے ہیں۔اسلام کا نظریہ امن وسلامتی دائمی اصولوں کے تحت لازوال بنیادوں پر قائم استوار ہے جس میں مملکت کی عمارت کو امن کی مضبوط و مستحکم بنیادوں پر اُٹھایا گیا ہے۔[2]

ایمان و عمل دونوں لازم وملزوم ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے مسلم اور مومن کی تعریف ہی یہ کی ہے۔

((المسلم من سلم المسلمون من لسانه و يديه))[3]

مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

((سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ، وَقِتَالُهُ كُفْرٌ))[4]

کسی مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس سے قتال کرنا کفر ہے۔

((مَنْ قَتَلَ مُعَاهَدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ، وَإِنَّ رِيْحَهَا تُوْجَدُ مِنْ مَسِيْرَةِ اَرْبَعِيْنَ عَامً))[5]

جس نے کسی معاہد (غیر مسلم شہری) کو قتل کیا تو وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھے گا حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس برس کی مسافت تک محسوس ہوتی ہے۔

---

[1] الشوریٰ:43۔

[2] محمد حمید اللہ، **پیغمبر امن حضرت محمد ﷺ**، (لاہور: مکتبہ دانیال، 2010) ص8۔

[3] بخاری، **الجامع الصحیح**، کتاب الایمان، باب المسلم من لسانه، ح10۔

[4] **ایضا**، کتاب الإیمان، باب خوف المومن من ان یحبط عمله وهو لا یشعر، ح:48۔

[5] **ایضا**، کتاب الجزیة، باب إثم من قتل معاهدا بغیر جرم، ح2995۔

بابا فریدؒ کی تعلیمات کی بدولت ہم معاشرے سے جن برائیوں کا خاتمہ کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں، اور یہ ہی مسائل عصرِ خاصر میں درپیش بھی ہیں۔ جن کو حل کرنا اُمتِ مسلمہ کے لیے ضروری ہے۔ بابا فریدؒ کی شاعری میں واضح طور پر امن و محبت اور رواداری کا پیغام ہے۔ جو ہمارے معاشرے لے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔

رواداری کے معانی:

ابتدائے دنیا سے اللہ تعالیٰ نے جتنے انبیاء کرام مبعوث فرمائے ان سب کا مقصد معرفت الٰہی انسانوں کا روحانی، اخلاقی تزکیہ اور دنیوی و اخروی سعادت پیش کرنا رہا ہے۔ اسلام سے پہلے تمام مذاہب قومی تھے، یعنی ایک قوم کے ساتھ مخصوص تھے۔ اس قوم کے افراد کے علاوہ کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن اسلام ان مذاہب سے بہت مختلف ہے، اسلام کے دائرہ میں ہر ایک کو آنے کی اجازت تھی۔ رنگ و نسل کا کوئی امتیاز نہ تھا، ذات پات کی کوئی تمیز نہ تھی۔ ہر ایک کے ساتھ مساوی سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ اگر کسی کو کوئی فوقیت حاصل تھی تو وہ صرف تقویٰ کی بنیاد پر۔ اپنے مخالف لوگوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا، ان کے حق میں کوئی ایسی بات نہ کہنا جو ان کی دل آزاری کا سبب ہو، ان سے اخلاقی نرمی سے بات کرنا، ان کے مذہب میں آزادی ضمیر کا حق دینا، ضرورت پر ان کی امداد کرنا اور ہمدردی کرنا، مصیبت اور مشکل میں اس کی اعانت کرنا۔[1]

ان سے اپنے دل میں کینہ اور بغض نہ رکھنا، ان کو اپنے ہی جیسا انسان اور اپنے یہ مانند خدا کی مخلوق سمجھنا، ان پر کسی وقت اور کسی حالت ظلم و ستم نہ کرنا، ان کو حقیر اور ذلیل نہ سمجھنا یہ سب رواداری کے زمرے میں آتا ہے۔

جب ہم اسلام کی تعلیمات کا جائزہ لیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی رواداری کو پرکھتے ہیں تو ہمیں ایک ایسے ماحول کا تصور ملتا ہے۔ جہاں انسان کے انسان ہونے میں کوئی فرق نہیں رکھا جاتا، اگر کوئی فرق رکھا جاتا ہے تو وہ محض اچھے اعمال کی بنیاد پر۔ محض ذات پات، رنگ و نسل اور طبقات کی بنیاد پر امتیاز و برتری کو اسلام نے سرے سے خارج کر دیا ہے۔

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ﴾[2]

---

[1] عبدالرحمن، سید صباح الدین، **اسلام میں مذہبی رواداری**، (اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، 1987)، ص 94۔

[2] الحجرات: 13۔

ترجمہ :اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہارے خاندان اور قومیں جو بنائی ہیں تاکہ تمہاری آپس میں پہچان ہو، بے شک زیادہ عزت والا تم میں سے اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیز گار ہے، بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا خبر دار ہے۔

اسلام نے جبر سے کام نہیں لیا اس کے بر عکس اسلام نے اپنے چاہنے والوں کا دل جیتا ہے اور اپنے چاہنے والوں کے دلوں کو اسلام کی طرف مائل کیا ہے۔

لغوی معنی:

لغوی حوالے سے ''روا'' کا مطلب ہے جائز، مباح، درست، ٹھیک۔اور ''روادار'' کا مطلب ہے جائز رکھنے والا، مباح رکھنے والا۔تو ''رواداری'' کا مطلب ہوا کہ کسی بات کو رعایت سے جائز رکھنا۔ ''اس کے معانی رعایت رکھنا یا جائز رکھنا کے ہیں''[1]

رواداری کے معنی عربی زبان کے لفظ "**تسمح، تسامح**" سے ماخوذ ہیں۔یعنی نرمی برتنا اور دوسروں سے در گزر کرنا۔اسی لیے عربی میں لفظ ''**التسامح الدینی**'' مستعمل ہے۔یعنی مذہبی رواداری جس کا ایک معنی مذہبی برداشت بھی بنتا ہے۔[2]

عربی زبان کی مشہور لغت ''**معجم اللغة العربية المعاصرة**'' میں ''**التسامح الديني**'' کی تعریف اس طرح سے کی گئی ہے:

''**في المعجم ''التسامح الديني: احترام عقائد الآخرين**''[3]

''لغت میں مذہبی رواداری کا مطلب ہے دوسروں کے عقائد کا احترام''

''**من ناحية مصطلحات فقهية السماحة في طلب الدين أي الترفق وبشاشة الوجه**''[4]

فقہ کی اصطلاح میں مذہب میں رواداری کا خندہ پیشانی سے اظہار کرنا، یعنی نرمی اور خوش گوار چہرہ۔

---

[1] فیروزالدین، **فیروزاللغات اردو جامع**،(لاہور: مطبوعہ فیروز سنز،2010)،ص723۔

[2] ایضاً،ص360۔

[3] أحمد مختارعبدالحميد عمر، **معجم اللغة العربية المعاصرة**،(بيروت:عالم الكتب الطبعة:الأولى، 1429 هـ-2008)،ج: 4، ص 105۔

[4] https://www.almaany.com/ar/dict/ar-ar/التسامح-الديني/

انگریزی زبان میں رواداری کے لیے "TOLERANCE" کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جس کا معانی تحمل، برداشت اور صبر کرنے کے ہیں۔اسی طرح "TOLERATION" یعنی مذہبی رواداری بھی استعمال کیا جاتاہے۔

رواداری بے تعصبی اور کسی بات کو رعایت سے جائز رکھنا کے معنی میں آتاہے۔اس سے یہ مراد بھی ہے کہ فراخ دلی، وسیع القلبی، تحمل و بردباری سے کام لیا جائے۔ رواداری کے زمرے میں ایک بہت اہم بات میرے نزدیک یہ ہے کہ ایسی بات کا جائزاور مباح جاننا، جس بات میں کوئی مذہبی، اخلاقی یا قانونی حرج نہ ہو۔اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رواداری فکری واعتقادی، رنگ و نسل اور وطن و زبان کی بنیاد پر کسی عصبیت کا شکار ہوئے بغیر صبر و تحمل سے ایک دوسرے کو برداشت کرے۔ کوئی انسان، گروہ یا حکومت دوسروں کے ان افکار و خیالات کو خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو، صرف دوسروں کے جذبات واحساسات کالحاظ کرتے ہوئے برداشت کرے۔[1]

رواداری کے اصطلاحی معانی

اصطلاحی معنوں میں رواداری سے مراد تحمل و بردباری کے ساتھ ایسے نظریات کو برداشت کرنا ہے اور انھیں اختیار کرنے کی اجازت دینا ہے۔ جو ہماری نظر میں ناپسندیدہ یا غلط ہوں۔اگر کوئی شخص یا گروہ ہم سے مذہبی اختلاف کرتا ہے تو اسے اپنا نقطہ نظر اپنانے، اس نقطہ نظر کے مطابق زندگی بسر کرنے اور ہمارے ساتھ ایک اچھے ماحول میں بغیر کسی عصبیت کے سماجی تعلقات قائم رکھنا مذہبی رواداری ہے۔ رواداری تحمل اور برداشت کی ایک ایسی صورت ہے۔ جو کسی ناپسندیدہ چیز کی موجودگی میں ظاہر کی جائے۔

رواداری کو آزادی سے مختلف سمجھنا چاہیے، کیونکہ اس کے وجود کا اطلاق اسی چیز پر ہوتا ہے جس کو ایک غیر متفقہ یا بری چیز سمجھا جاتاہے۔ رواداری کا لفظ اپنے مطلب میں ناپسندیدگی کے معانی رکھتاہے۔ ہم ایسی چیز سے رواداری نہیں کر سکتے جس سے ہم لطف اندوز ہوتے ہوں، جس کو ہم پسند کرتے ہوں یا قبول کرتے ہوں۔ رواداری کا ایک معانی برداشت بھی ہے، اور اسکا متضاد عدم برداشت ہے۔[2]

---

[1] باغبتی، متین طارق، **اسلام اور رواداری**، (دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی، 1986)، ص82۔

[2] محمد شارق، **"بین المذاہب رواداری، اسلوب اور دائرہ کار"** (مقالہ برائے ایم۔فل، شعبہ علوم اسلامیہ وفاقی اُردو یونیورسٹی، کراچی، 2007)، ص58۔

التسامح الدینی (مذہبی رواداری) کی بہت سارے اہل علم نے تعریفیں کی ہیں جیسا کہ طاہر ابن عاشور کہتے ہیں[1]:

معاملات میں آسانی کو اعتدال کہا جاتا ہے جو آسانی اور مشکل کے درمیان کا ہوتی ہے اور یہ صرف باتوں سے نہیں بلکہ عمل سے بھی ظاہر ہونی چاہیے۔ اور اسی کی طرف ہمیں اسلام بلاتا ہے جیسے اللہ پاک قرآن پاک میں فرماتا ہے؛

﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَٰكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى ٱلنَّاسِ وَيَكُونَ ٱلرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾

''اور ہم نے تمہیں معتدل امت بنایا تاکہ تم دوسروں کے لیے گواہ رہو۔''

مغرب میں مذہبی رواداری کے بارے میں بات کرتے ہوئے ایک مصنف لکھتا ہے[2]:

مذہبی رواداری کا مطلب ہے کہ غالب مذہب کے ماننے والوں کی طرف سے دوسرے مذاہب کے لوگوں کی مذہبی آزادی اور ان کو برداشت کرنا۔" برداشت اور غالب مذہب کے ماننے والوں کی کے وجود کے لیے دی گئی اجازت سے زیادہ نہیں۔

اصطلاحی مفہوم میں عام طور پر یہ لفظ اپنے نظریات پہ قائم رہتے ہوئے اور ان پر عمل کرتے ہوئے دوسروں کے عقائد و نظریات کو برداشت کرنے اور انھیں ان پر عمل کرنے کی آزادی عطا کرنے کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ بات رواداری میں شامل ہے کہ مختلف مذاہب کے پیروکاروں کو ان کے عقائد کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی دی جائے۔ مگر یہ آزادی اس شرط کے ساتھ دی جاتی ہے کہ نہ تو دوسروں کی آزادی میں خلل انداز ہو اور نہ ہی اس سے معاشرے کا امن و سکون اور سلامتی یا ملکی دفاع و سلامتی کے لیے خطرے کا باعث ہو گا۔[3]

رواداری کسی بھی رویہ، اقدام، بات اور انداز کا قابلِ قبول ہونا ہے۔ رواداری کی ایک بہترین مثال ہماری روز مرہ زندگی کا حصہ بھی ہے جب ہم چلتے ہیں تو ایک پاؤں جب قدم بڑھاتا ہے تو دوسرا پاؤں اس کے ساتھ چلتا ہے، اس کا ساتھ دیتا ہے۔ ایک پاؤں زمین کو دباتا ہے تو دوسرا آگے بڑھتا ہے۔ اسی طرح دونوں یہ افعال انجام دیتے ہوئے مکمل ہم آہنگی کے ساتھ آگے بڑھتے رہتے ہیں اور پیچھے بھی ہٹتے رہتے ہیں۔ ان کے درمیان ایک دوسرے کو برداشت

---

[1] ابن عاشور، طاهر، **مقاصد الشريعه الاسلاميه**،(تونس: الشركه التونس للنشر والتوزيع، 2011)، ص، 60-

[2] Perez Zagorin, *How the Idea of Religious Toleration Came to the West* (Princeton: Princeton University Press 2003), 5-6.

[3] نورالدین، **''اسلام میں رواداری کا تصور''**،(مقالہ برائے پی-ایچ-ڈی، شعبہ علوم اسلامیہ بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان)، ص89۔

کر کے اور ہم آہنگی کے ساتھ چلتے رہنے کا نام رواداری ہے۔ دوسروں کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھنا، اور اس کا اظہار کرنا بھی رواداری ہے۔ ناقابل قبول حالات میں قابل قبول رویہ اختیار کرنا بھی رواداری ہے۔[1]

رواداری کی ضرورت واہمیت

اہلِ اسلام کے لیے رواداری دین کا باقاعدہ حصہ ہے۔ اسلام تمام مذاہب کو رواداری کے اصول کے تحت آزادی دیتا ہے، اور دیگر مذاہب میں مداخلت یا ان کے ساتھ جبر واکراہ پر مبنی رویہ کا حکم نہیں دیتا ہے۔ اسلام نے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو ان کے عقائد کے مطابق عبادت کرنے کی صرف اجازت ہی نہیں دی بلکہ ان کے ساتھ باہمی امور کی اساس پر اتحاد کی دعوت دی ہے۔ اسلام کی تعلیمات میں کوئی مثال ایسی نہیں ملے گی، جس سے اسلام کی تبلیغ میں زور، جبر، زبردستی یا تشدد استعمال ہوا ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہے کہ دین کے بارے میں کسی قسم کا جبر نہیں ہے۔

((حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ رَافِعٍ ، حَدَّثَنَا مَرْوَانُ بْنُ مُعَاوِيَةَ ، حَدَّثَنَا يَزِيدُ بْنُ زِيَادٍ ، عَنِ الزُّهْرِيِّ ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:" مَنْ أَعَانَ عَلَى قَتْلِ مُؤْمِنٍ بِشَطْرِ كَلِمَةٍ، لَقِيَ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ مَكْتُوبٌ بَيْنَ عَيْنَيْهِ آيِسٌ مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ-))[2]

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص کسی مومن کے قتل میں آدھی بات کہہ کر بھی مددگار ہوا ہو، تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کی پیشانی پر آیس من رحمة الله ''اللہ کی رحمت سے مایوس بندہ'' لکھا ہوگا''

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اسلام نے ہر طرح سے انسانوں کے حقوق مقرر کیے ہیں یہاں تک کہ اسلام نے جانوروں اور پرندوں کو بھی حقوق دیئے ہیں کہ ان کے ساتھ بھی کسی قسم کی ناانصافی اور ظلم نہ کیا جائے۔ تو انسان تو جنوں اور جانوروں سے بہتر ہے۔ اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ مسلمان کس طرح غیر مسلموں

---

[1] عبدالحئ، محمد، **رواداری**، (رام پور: مرتضیٰ پریس، س ن)، ص13۔

[2] ابن ماجہ، محمد بن یزید، **السنن**، کتاب الدیات، باب الغلیظ فی قتل المسلم ظلما، (ریاض: دارالسلام للنشر والتوزیع، 1999ء)، ح2620۔

کے ساتھ سلوک کرتے ہیں؟ کیا اسلام ان کے ساتھ امن و رواداری کا سلوک کرتا ہے یا اسلام کے غالب ہونے کے بعد سب غیر مسلموں کو قتل یا ملک بدر کر دینا چاہیے۔

اس کے جواب میں رادیکا کنچنا نے اپنے ایک مقالے میں جامع الازھر کے امام احمد الطیب کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوا کہا:

> Aḥmad al-Ṭayyib, the Grand Imam of the renowned Al-Azhar Sunni Arab institution of learning in Egypt, made four points at the Islamic-Christian conference in Cairo (28 Feb–1 Mar 2017). This came to be called the Al-Azhar Declaration, which asserted that Islam is compatible with religious pluralism. He upheld the principle of equality of rights and duties for both Muslims and non-Muslims within a "national constitutional state." He insisted that the concept of "citizenship" was part of the foundations of Islam, citing reference to the Prophet's Constitution of Medina in the first Muslim society.[1]
>
> ''مصر کے معروف تعلیمی ادارے الازہر کے سب سے بڑے امام احمد الطیب نے قاہرہ میں، اسلامی-عیسائی کانفرنس (28 فروری-1 مارچ 2017) میں چار بہت اہم نکات پیش کیے۔ بعد میں ان چار نکات کو ''الازہر کا اعلامیہ'' کہا گیا، جس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ اسلام مذہبی تکثیریت کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ انہوں نے ''قومی آئینی ریاست'' کے اندر مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے حقوق اور فرائض کی مساوات کے اصول کو برقرار رکھا۔ مدینہ کے پہلے مسلم معاشرے میں پیغمبر ﷺ کے آئین کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ "شہریت" کا تصور اسلام کی بنیادوں کا حصہ ہے۔''

نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم بھی ملا تھا۔ کہ جنگ کے بعد جو لوگ پُرامن طریقہ سے رہنا چاہتے ہوں تو ان پر مذہب کے معاملے میں کوئی زور اور دباؤ نہ ڈالا جائے۔ ان کے خلاف کوئی مذہبی جنگ بھی نہ کی جائے۔ اور نبی کریم ﷺ نے اپنے کسی قیدی پر اسلام لانے پر جبر نہیں کیا، آپ ﷺ قیدیوں کو کلام پاک سناتے، اسلام لانے کی دعوت دیتے، اگر وہ اسلام نہ لاتے تو ان کو امن کی جگہ پہنچا دیتے، قرآن پاک میں لڑائی کے میدان میں بھی دشمنوں سے رواداری کی تلقین کی گی ہے۔ خیر الامت کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان دنیا میں اس لیے ہیں کہ وہ یہاں خیر بن کر نیکیاں پھلائیں، برائیوں سے پرہیز کریں۔ جب ان کو خیر الامت ہونے کی بشارت دی گئی ہے تو تبلیغ کے سلسلے میں ان کو ظالم اور سفاک بنے کی تعلیم کیسے دی جاسکتی تھی۔ کوئی مسلمان حکمراں یا فاتح ایسا ہوا تو وہ اپنی

[1] Radhika Kanchana, "How do Muslim States Treat their "Outsiders"? Is Islamic Practice of Naturalisation Synonymous with Jus Sanguinis?" in *Migration and Islamic Ethics: Issues of Residence, Naturalisation and Citizenship*, ed., Ray Jureidini amd Said Fares Hassan (Laiden: Brill, 2002), 136.

کمزوریوں سے ہوا نہ کہ اپنی مذہبی تعلیم کی بناپر ہوا۔ نبی کریم ﷺ نے اس پر عمل کیا، برائی کی مدافعت نیکی سے کی، ظلم کا جواب صبر کر کے دیا تو آپ ﷺ کے دشمن بھی آپ ﷺ کے گرد جمع ہو گئے اور اسلام کے دائرہ میں داخل ہوتے گے۔[1]

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمیں بھی اسلام کے بتائے ہوئے راستے پر عمل کر کے غیر مسلم لوگوں کو اپنے دین کی دعوت دینا ہو گی۔ان کو ان کے دین پر چلنے دیے اور مکمل آزادی کے ساتھ ان کو ان کے عقائد پر عمل پیرا ہونے دے۔مذہبی جھگڑوں میں عام طور پر لوگ مخالفین کے قابل اشخاص اور اشیاء کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال کرتے ہیں۔قرآن نے اس قسم کے غیر مہذب جملوں سے منع کیا ہے۔حتی کہ مشرکین کے جھوٹے دیوتاؤں کے متعلق بھی برے الفاظ استعمال کرنے سے منع کیا ہے۔کیونکہ اس طرح ان کی طرف سے خدائے واحد کے خلاف غلط باتیں منسوب کیے جانے کا خطرہ ہے۔[2]

مذہبی لحاظ سے رواداری کی ضرورت واہمیت

دین اسلام کی عالمگیر کتاب قرآن حکیم باہمی امن اتحاد اور رواداری کا قائل ہے۔اور اس کی مثالی تعلیمات اس بات پر شاہد ہیں کہ قرآن حکیم نے ہر کڑے وقت میں اپنے اصول کے ذریعے دنیا سے انتشار کو ختم کرنے میں پہل کی۔شروع اسلام میں جب اسلام اور دیگر مذاہب کے ماننے والوں میں انتشار اور جھگڑا بڑھا تو قرآن حکیم نے اس بات کی طرف توجہ کی اور مذاہب سماویہ کو وحدت کی طرف پکارا۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿ قُلْ يَآ اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ﴾[3]

ترجمہ:"اے اہلِ کتاب جو بات ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے اس کی طرف آو"

قرآن کریم نے اس سلسلہ میں یہ عظیم اور اساسی اصول بیان کیا ہے،اہلِ اسلام کے لیے رواداری کی اہمیت اور ضرورت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے۔قرآن کریم میں رواداری کا براہ راست حکم آتا ہے۔

---

[1] محمد مسعود احمد "**رواداری تاریخ کی روشنی میں**"(مقالہ برائے پی ایچ ڈی،ادرہ مسعودیہ،1997)۔

[2] جعفری،رئیس احمد،**اسلام اور رواداری**،(لاہور:رفیق ادارہ ثقافت اسلامیہ،1957)،ص350۔

[3] آلِ عمران:64۔

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ﴾ [1]

ترجمہ: اپنے رب کے راستے کی طرف دانشمندی اور عمدہ نصیحت سے بلا، اور ان سے پسندیدہ طریقہ سے بحث کر، بے شک تیرا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کے راستہ سے بھٹکا ہوا ہے، اور ہدایت یافتہ کو بھی خوب جانتا ہے۔

اسلام کے عقیدے کی بناپر نبی کریم ﷺ نے قانونی حیثیت سے دنیا کی قوموں کو ان کے علیحدہ علیحدہ حقوق مقرر کیے۔ جن پر اسلام کی تیرہ صدیوں میں برابر عمل ہوتا رہا، اور اسی کی بنیاد پر اسلام پھیلا اور معاشرے میں امن و سلامتی کو فروغ حاصل ہوا۔ نبی کریم ﷺ نے یہود مدینہ کے ساتھ تاریخ ساز معاہدہ "میثاق مدینہ" کیا۔ جو غیر مسلم رعایا کے ساتھ نبی کریم ﷺ کا پہلا معاہدہ تھا۔ یہ معاہدہ مذہبی رواداری اور فراخ دلی کی ایک ایسی مثال ہے۔ جس پر دنیا فخر کر سکتی ہے، موجودہ دور کی اقوام متحدہ بھی فریقین میں اس سے بہتر رواداری پر مبنی معاہدہ نہیں کرا سکتی۔ میثاق مدینہ انسانیت کے علمبردار، محسن انسانیت ﷺ کی سیاسی بصیرت اور حسن تدبر کا مثالی اور تاریخی شاہکار ہے۔ جس سے اسلامی معاشرے کے مقاصد، پرامن بقائے باہمی، مثالی مذہبی رواداری، قیام امن اور انسانی اقدار کے تحفظ میں بھرپور مدد ملی، ایک عظیم الشان ریاست کی بنیاد اور تنظیم وتدبیر کا بے مثال کارنامہ ہے۔[2]

((حَدَّثَنِي عَمْرٌو النَّاقِدُ وَابْنُ أَبِي عُمَرَ قَالَ عَمْرٌو حَدَّثَنَا سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ عَنْ أَيُّوبَ عَنْ ابْنِ سِيرِينَ سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُولُ قَالَ أَبُو الْقَاسِمِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ أَشَارَ إِلَى أَخِيهِ بِحَدِيدَةٍ فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَلْعَنُهُ حَتَّى يَدَعَهُ وَإِنْ كَانَ أَخَاهُ لِأَبِيهِ وَأُمِّهِ-))[3]

ایوب نے (محمد) ابن سیرین سے روایت کی، کہا: میں نے حضرت ابوہریرہؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ابوالقاسم ﷺ نے فرمایا: "جس نے اپنے بھائی کی طرف لوہے کے کسی ہتھیار سے

---

[1] النحل: 125۔

[2] حافظ محمد طارق، **رواداری کا اسلامی تصور سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں**، (لاہور: مقالہ برائے پی۔ایچ ڈی، پنجاب یونیورسٹی، 2017)، ص46۔

[3] القشیری، مسلم بن حجاج، **الجامع الصحیح**، كِتَابُ الْبِرِّ وَالصِّلَةِ وَالْآدَابِ، بَابُ النَّهْيِ عَنِ الْإِشَارَةِ بِالسِّلَاحِ إِلَى مُسْلِمٍ، (ریاض: دارالسلام للنشر والتوزیع، 1999ء)، ح2616۔

اشارہ کیا تو اس پر فرشتے لعنت کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ اس کام کو ترک کر دے، چاہے وہ اس کا ماں باپ یا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔

اس تاریخی معاہدہ کی بدولت غیر مسلموں اور مختلف المذہب افراد و اقوام کے حقوق و فرائض اور مذہبی آزادی اور رواداری کا اصول وضع ہوا، چنانچہ یہود مدینہ اور دیگر غیر مسلم اقلیتوں کو مذہبی رواداری پر مبنی اس تاریخی صحیفہ کی بدولت مندرجہ ذیل حقوق و مراعات حاصل ہوئیں۔

- اللہ تعالیٰ کی حفاظت و ضمانت ہر فریق کو حاصل ہے۔
- امت کے غیر مسلم ممبروں کو بھی مسلمانوں کی طرح سیاسی اور مذہبی حقوق حاصل ہیں۔امت کے ہر گروہ کو مکمل آزادی اور اندرونی خود مختاری حاصل ہے۔
- امت کے دشمنوں سے مسلم اور غیر مسلم دونوں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔[1]

اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو داخلی و خارجی اور مذہبی ظلم و زیادتی سے بچانا شریعت اسلامیہ کی رو سے ضروری ہے۔اور یہ ان کا حق ہے، غیر مسلموں کے حقوق بھی اسی طرح ہیں جس طرح مسلمانوں کے ہیں کیونکہ وہ جزیہ ادا کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کو قبل از ہجرت مکہ میں ہی یہود کی مخالفت اور دشمنی کا علم ہو چکا تھا۔ مدینہ آنے کے بعد اس کا عینی مشاہدہ بھی ہوا اس لیے آپ ﷺ نے مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد جو پہلا کام کیا وہ انصار اور یہودِ مدینہ کے ایک ایک قبیلہ سے معاہدہ صلح و امن تھا۔اس معاہدے کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ یہود کی مخالفت اور آگے نہ بڑھنے پائے اور آپ ﷺ اور مسلمانوں کے بارے میں ان کو جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں اس کو ختم کیا جا سکے۔ آپ ﷺ کا اور آپ ﷺ کے صحابہ نے یہود سے اپنا رویہ نہایت مصالحانہ، خیر خواہانہ اور روادارانہ رکھا۔ نبی کریم ﷺ خود یہود کے مریضوں کی عیادت کرتے ان کے جنازے گزرتے تو احتراماً کھڑے ہو جاتے، چھینک آنے پر دعائیہ کلمات ارشاد فرماتے، جب تک کسی مسئلہ میں قرآن کا صریح حکم نازل نہ ہو جاتا تب تک آپ ﷺ تورات کے حکم پر عمل کرتے اور آپ ﷺ خود یہود سے مشورہ کرتے۔ آپ ﷺ اور صحابہ ان کی اتباع میں عاشورہ کا روزہ رکھتے۔ یہود آپ ﷺ

[1] اشرفی، محمد طاہر محمود، **رواداری سیرت طیبہ کی روشنی میں**، (لاہور: عمر پبلیکیشنز، 2016)، ص 33۔

سے اور آپ ﷺ کے صحابہ سے بحث مباحثہ کرتے مگر آپ ﷺ ناگواری کا اظہار نہ کرتے، یہود نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخیاں بھی کرتے لیکن صحابہ نے کبھی صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔[1]

حضرت معاذ بن فضالہ فرماتے ہیں کہ ہمارے سامنے سے ایک جنازہ گزرا تو نبی کریم ﷺ کھڑے ہو گئے اور ہم بھی کھڑے ہو گئے، پھر ہم نے کہا کہ یارسول اللہ! یہ تو یہودی کا جنازہ تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم لوگ جنازہ دیکھو تو کھڑے ہو جایا کرو۔

((حَدَّثَنَا مُعَاذُ بْنُ فَضَالَةَ حَدَّثَنَا هِشَامٌ عَنْ يَحْيَى عَنْ عُبَيْدِ اللَّهِ بْنِ مِقْسَمٍ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ مَرَّ بِنَا جَنَازَةٌ فَقَامَ لَهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقُمْنَا بِهِ فَقُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّهَا جِنَازَةُ يَهُودِيٍّ قَالَ إِذَا رَأَيْتُمْ الْجِنَازَةَ فَقُومُوا۔))[2]

ہم سے معاذ بن فضالہ نے بیان کیا' انہوں نے کہا کہ ہم سے ہشام نے بیان کیا' ان سے یحییٰ بن ابی کثیر نے بیان کیا' ان سے عبیداللہ بن مقسم نے اور ان سے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے کہ ہمارے سامنے سے ایک جنازہ گزرا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے اور ہم بھی کھڑے ہو گئے۔ پھر ہم نے کہا کہ یارسول اللہ! یہ تو یہودی کا جنازہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم لوگ جنازہ دیکھو تو کھڑے ہو جایا کرو۔

ہم اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ عربوں کی ابتدائی فتوحات میں مسلمانوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنانے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی یہودیوں اور عیسائیوں نے تلوار کے ڈر سے اپنا مذہب تبدیل کیا۔ شام فتح ہو جانے کے بعد کئی نسلوں تک شام کے عیسائی اپنے مذہب پر قائم رہے۔ لبنان میں آج تک عیسائی موجود ہیں۔ اگر عرب فتوحات عمل میں نہ آتیں تو ایک بڑی تعداد میں مسلمان اسپین مراکش، ایران اور ہندوستان میں نہ پہنچے ہوتے۔ جب ایک مرتبہ عربوں نے دور دراز کے ملکوں میں اپنے قدم جما لیے تو اس کے بعد انہوں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ یہودیوں، عیسائیوں اور آتش پرستوں کو اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کرنے کو کہیں۔ اس کے برخلاف ان عرب فاتحین نے اپنے مفتوحین کے ساتھ انتہائی رواداری کا سلوک

---

[1] جعفری، **اسلام اور رواداری**، ص255۔

[2] بخاری، محمد بن اسماعیل، **الجامع الصحیح**، کتاب الجنائز، باب جو یہودی کا جنازہ دیکھ کر کھڑا ہو گیا، (ریاض: دارالسلام 1412ھ)، ح1311۔

کیا۔ مفتوحہ اقوام نے مسلمان فاتحین کے اس رویے کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا۔ مراکش سے لے کر شمالی ہندوستان تک جو ریگستان کا سلسلہ چلا گیا ہے ان علاقوں میں رہنے والوں کے لیے سیدھی سادی اسلامی تعلیمات بڑی ہی پرکشش اور موزوں ثابت ہوئیں ۔انہوں نے اس مذہب کو اپنے لیے انتہائی موزوں اور مناسب سمجھا۔ 712 میں جب مسلمانوں نے اسپین پر قبضہ کیا تھا تو مفتوحین کو اپنے مذہب پر عقیدہ و عمل کی پوری آزادی دی تھی۔یہودیوں اور عیسائیوں کو صرف جزیے کی ادائیگی کے لیے کہا گیا تھا۔[1]

قانونی لحاظ سے رواداری کی ضرورت واہمیت

دینی وفکری رواداری کے مختلف درجے ہیں۔رواداری کا ادنٰی ترین درجہ یہ ہے کہ آپ دوسرے کو دین اور عقیدے کی آزادی دے دیں۔اور انہیں اپنے دین میں زبردستی داخل ہونے پر مجبور نہ کریں۔ان کے ساتھ ایسا سلوک نہ کریں مثلاً انہیں اپنے جان و مال سے ہاتھ دھونے پڑیں، تشدد یا جلاوطنی جیسی سزاؤں کا سامنا کرنا پڑے، جیسا کہ متعصب لوگوں کا اپنے دینی مخالفین کے ساتھ رہ ہے۔اور اوسط درجے کی رواداری یہ ہے۔کہ آپ دوسرے کو اس کے اختیار کردہ دین و مذہب میں اعتقاد رکھنے دیں۔ پھر اسے نہ کوئی ایسا کام ترک کرنے پر مجبور کریں جسے وہ ضروری سمجھتا ہو،اور نہ کوئی ایسا کام کرنے پر جسے وہ حرام اور ناجائز سمجھتا ہو۔اور اس سے بلند تر درجہ یہ ہے کہ ہم دوسروں پر ان امور میں بھی سختی نہ کریں، جنہیں وہ اپنے دین میں ومذہب میں تو حلال تصور کرتے ہیں۔ مگر ہمارے ہاں وہ حرام ہیں۔ذمیوں کے ساتھ یہ سلوک کرنے کے باعث مسلمان رواداری کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے ہر اس چیز کا احترام جس کو غیر مسلم اپنے دین کے مطابق حلال سمجھتے تھے۔اور ان کے لیے اس میں بہت گنجائش رکھی اور ان کی روک ٹوک اور ممانعت نہیں کی۔ حالانکہ ریاستی قانون اور مذہب کا خیال کرتے ہوئے وہ ان چیزوں کو اس طرح حرام قرار دے سکتے تھے۔[2]

اور ان پر تعصب کی کوئی تہمت بھی نہ لگے۔اسلام کی تعلیمات یہ ہیں کہ دوسروں کو ان کے مذہب سے متعلقہ پوری آزادی دو،اور اپنے مذہب کی تبلیغ جاری رکھو نرم اور بہترین طریقے سے کرو، یہی وہ رواداری ہے۔[3]جو ایک حق پرست

---

[1] ثانی، حافظ محمد، **تجلیاتِ سیرت ﷺ**، (کراچی: فضلی سنز اردو بازار، 2000)، ص50۔

[2] مودودی، سید ابوالاعلیٰ، **تفہیمات**، (لاہور: شاہ عالم مارکیٹ، 2000)، ص115۔

[3] راشدی، زاہد "**غیر مسلموں سے سلوک اور سیرت نبوی ﷺ**" (ورجینیا: دارالہدیٰ 2007)، ص6۔

، صداقت پسند اور سلیم الطبع انسان اختیار کر سکتا ہے۔ وہ جس کو صحیح سمجھتا ہے اس پر سختی کے ساتھ قائم رہے گا۔ اپنے عقیدے کا صاف صاف اظہار و اعلان کرے گا۔ دوسروں کو اس عقیدے کے طرف دعوت بھی دے گا مگر کسی کی دل آزاری نہ کرے گا، کسی سے بد کلامی نہ کرے گا۔[1]

ہمارے ملک میں رواداری نہ صرف اسلام کی حدود میں ہے ، بلکہ یہ ہمارے قانونی نظام کا بھی حصہ ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور بھی عین اسلام کے مطابق ہے جس طرح اسلام مساوات، عدل و انصاف کا قائل ہے اس طرح یہ اسلامی ملک بھی اسی چیز کا قائل ہے۔

آرٹیکل نمبر19

- قانون کے ذریعے عائد کردہ مناسب پابندیوں اور ضوابط کے تابع ہر شہری کو عوامی اہمیت کی حامل تمام معلومات تک رسائی کا حق حاصل ہو گا۔[2]

آرٹیکل نمبر20

قانون، امنِ عامہ اور اخلاق کے تابع:

- ہر شہری کو اپنے مذہب کی پیروی کرنے اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا حق ہو گا۔
- ہر مذہب، گروہ اور فرقے کو اپنے مذہبی ادارے قائم کرنے، برقرار اور ان کا انتظام کرنے کا حق ہو گا۔

آرٹیکل نمبر21

- کسی شخص کو کوئی ایسا خاص محصول ادا کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا جس کی آمدنی اس کے اپنے مذہب کے علاوہ کسی اور مذہب کی تبلیغ و ترویج پر صرف کی جائے۔

---

[1] مودودی، **تفہیمات**، ص116۔

[2] جسٹس پراچہ، الشکور، **اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور**، (2018)، ص12۔

آرٹیکل نمبر22

- کسی تعلیمی ادارے میں تعلیم پانے والے کسی شخص کو مذہبی تعلیم حاصل کرنے یا کسی مذہبی تقریب میں حصہ لینے یا مذہبی عبادت میں شرکت کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، اگر ایسی تعلیم، تقریب یا عبادت کا تعلق اس کے اپنے مذہب کے علاوہ کسی اور مذہب سے ہو۔
- کسی مذہبی ادارے کے سلسلے میں محصول لگانے کی بابت استثناء یا رعایت منظور کرنے میں کسی فرقے کے خلاف کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا۔

قانون کے تابع:

- کسی مذہبی فرقے یا گروہ کو کسی تعلیمی ادارے جو کلی طور پر اس فرقے یا گروہ کے زیرِ اہتمام چلایا جاتا ہو، اس فرقے یا گروہ کے طلبا کو مذہبی تعلیم دینے کی ممانعت نہ ہو گی۔
- کسی شہری کو محض نسل، مذہب، ذات یا مقام پیدائش کی بنا پر کسی ایسے تعلیمی ادارے میں داخل ہونے سے محروم نہیں کیا جائے گا جسے سرکاری محاصل سے امداد ملتی ہو۔[1]

درج بالا آرٹیکل اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ اسلامی قانون میں رواداری کو بہت اہمیت حاصل ہے اور اسلام اس کو بھی فروغ دیتا ہے کہ ملک میں چاہے مختلف مذاہب کے لوگ موجود ہوں لیکن ان کے ساتھ متضادانہ رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی ان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے بلکہ جس طرح نبی کریم ﷺ مذاہب کی تقسیم سے بالاتر ہو کر اپنے معمولاتِ زندگی سرانجام دیتے رہے اور ساتھ میں احسن طریقے سے اپنے دین کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

اس ساری بحث سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے ماتحت رہنے والے غیر مسلم رعایا کو مساوی قانونی حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ان کے مذہب سے کسی قسم کا ردوبدل نہیں کیا جا سکتا۔ان کے اموال ان کی جان اور ان کی عزت و آبرو کی حفاظت اسلامی حکومت کے ذمہ ہوتی ہے اپنے مذہبی عہدے دار وہ خود متعین کرنے کے

---

[1] جسٹس پراچہ، **اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور**، ص15۔

مجاز ہیں اور ان کی عبادت گاہیں قابل احترام ہیں۔ امت کے غیر مسلم ممبروں کو بھی مسلمانوں کی طرح سیاسی اور مذہبی حقوق حاصل ہیں۔ امت کے ہر گروہ کو مکمل آزادی اور اندرونی خود مختاری حاصل ہے۔

فصل دوم: نبی کریم ﷺ کے غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات اور رواداری

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو تمام انسانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا اور جو بھی اس رحمت کے سائے تلے آیا۔اس نے بھی خیر پائی، نبی کریم ﷺ نے عفو ودر گزر کے عمل سے غیر مسلموں کو بھی اپنا گرویدہ بنالیا اور جو لوگ عرصہ دراز سے جہالت میں پڑے تھے انہوں نے بھی نبی کریم ﷺ کے نور سے فیض حاصل کیا۔اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو عدل وانصاف، مساوات اور رواداری کا سبق دیا اور نبی رحمت ﷺ نے اپنی زندگی میں اس کا بہترین نمونہ پیش کیا۔جیسا کہ اللہ پاک نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾[1]

"بے شک تمہیں رسول اللہ کی پیروی بہتر ہے"

ہجرت مدینہ کے بعدِ نبی کریم ﷺ کا واسطہ ایک نئے طرز کے لوگوں سے پڑا۔مدینہ کے یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ نبی کریم ﷺ نے ایک دوستانہ ماحول پیدا کیا اور انہیں اسلام کی طرف راغب کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ہجرتِ مدینہ سے اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی گئی۔ریاست کا قیام باقاعدہ آئین کے ذریعے کیا گیا جو میثاقِ مدینہ کے نام سے معروف ہے۔یہ میثاق مدینہ میں بسنے والی مختلف اقوام، یہود، مشرکین اور مسلمانوں کے مابین دستور کی حیثیت سے طے پایا۔اس میں مدینہ کی تمام اقوام اور ان کے ساتھ شامل ہونے والوں کے حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین کیا گیا۔اسکی حیثیت اگرچہ ایک آئینی حکم نامے کی سی ہے۔چونکہ آئین ایک طرح کا عہد نامہ ہوتا ہے جو ایک طرف حکومت اور دوسری طرف فراد کے حقوق وفرائض کی حدود کا تعین کرتا ہے۔

اسی طرح کے بہت سے معاہدے نبی کریم ﷺ نے غیر مسلموں کے ساتھ کیے اور ان کو اسی طرح کے حقوق عطا کیے جس طرح کے حقوق ایک مسلمان کو فراہم کیے گئے۔اس طرزِ عمل کو دیکھ کر بہت سے غیر مسلموں نے اسلام کو کھلے دل سے قبول کیا۔غیر مسلموں کے جو بیرونی وفود نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آتے ان کی نبی کریم ﷺ خود میزبانی فرماتے۔بنو حنیفہ کا سرکش سردار ثمامہ مسلسل اپنی ضد پر اڑا رہا اور اسلام قبول نہ کیا لیکن جب نبی کریم ﷺ کے پاس قیدی بن کر آیا تو نبی کریم ﷺ کے اعلیٰ اخلاق، عدل وانصاف اور رواداری کو دیکھ کر اتنا متاثر

[1] الأحزاب:21۔

ہوا کہ اسلام قبول کر لیا۔اس کے علاوہ معاہدہ نجران اور اس قسم کے دوسرے معاہدے مذہبی رواداری انسان دوستی اور غیر مسلموں کے مذہبی وانسانی حقوق کے عظیم چارٹر ہیں۔

مذہبی رواداری اور نبی کریم ﷺ کے غیر مسلموں سے تعلقات

کلام پاک میں رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کی جو تعلیمات دی گئی ہیں ان پر ہمارے رسول کریم ﷺ نے عمل کر کے دکھا بھی دیا، جس کی تائید کلام پاک سے بھی ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ﴾[1]

ترجمہ: "پھر اللہ کی رحمت کے سبب سے تو ان کے لیے نرم ہو گیا، اور اگر تو تند خو اور سخت دل ہوتا تو البتہ تیرے گرد سے بھاگ جاتے، پس انہیں معاف کر دے اور ان کے واسطے بخشش مانگ اور کام میں ان سے مشورہ لیا کر، پھر جب تو اس کام کا ارادہ کر چکا تو اللہ پر بھروسہ کر، بے شک اللہ توکل کرنے والے لوگوں کو پسند کرتا ہے۔"

آپ ﷺ کی تعلیم یہ بھی رہی کہ ایک دوسرے سے تعلقات منقطع نہ کرو، ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو، ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، ایک دوسرے سے حسد نہ کرو اور بھائی بھائی بن جاو۔ قریش، یہود اور نصاریٰ سب ہی نے آپ ﷺ کو طرح طرح کی ایذائیں دی مگر آپ ﷺ نے ان سب کو بہت ہی صبر تحمل اور بردباری سے برداشت کیا۔ مذہبی رواداری سے عالم انسانیت کو روشناس کرانے والی ہستی پیغمبر اسلام کی ذات گرامی ہے۔ نبی کریم ﷺ تاریخ انسانی میں پہلی شخصیت ہیں۔ جنہوں نے دوسرے مذاہب اور عقائد رکھنے والوں کے ساتھ تحمل و برداشت اور رواداری کا نہ صرف درس دیا بلکہ اس پر عمل بھی کیا، آپ ﷺ کے خلفاء اور آپ ﷺ کی امت نے غیر مسلموں سے رواداری کے اس سلوک کو ہمیشہ جاری رکھا۔[2]

---

[1] آلِ عمران: 159۔

[2] محمد حمید اللہ، **اسلامی ریاست** (لاہور: الفیصل کتب اُردو بازار، 2005)، ص 55۔

رسول ﷺ نے اسلامی معاشرے کی تشکیل کا ایسا نمونہ پیش کیا جس میں انفرادی واجتماعی احکام خداوندی کو نافذ کر کے دکھایا آپ ﷺ نے ایک فرد کے دوسرے افراد اور ایک ریاست کے دوسری ریاستوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے اصول وضوابط سے متعلق عملی نمونے پیش کئے۔ دیگر اقوام کے ساتھ تعلقات کے لیے آپ ﷺ نے مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ معاہدات فرمائے۔ غیر مسلموں کے ساتھ کیے جانے والے معاہدات مختلف نوعیت کے تھے۔ان میں تجارتی، دفاعی اور دیگر جنگی معاہدات شامل تھے۔ نبی کریم ﷺ کا اسوہ حسنہ وہ واحد معیار ہے جو اسلام کے ان آفاقی اصولوں کی عملی تعبیر و تشریح ہے۔ سیرت طیبہ کے دیگر گوشوں کی طرح آپ ﷺ کے غیر مسلموں سے معاہدات بھی قیامت تک کے مسلمان اپنے سیاسی، معاشی، تہذیبی اور سماجی مسائل جنگ و جدل اور مخاصمت وعداوت کے ذریعے حل کرنے کی بجائے غیر مسلم ریاستوں سے باعزت انداز میں ڈپلومیسی اور معاہدات کے ذریعے حل کر سکتے ہیں۔اس سلسلے میں بھی نبی کریم ﷺ کی تعلیمات اُمتِ مسلمہ کے لیے نورِ مشعل ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی سیرت سے ایسے متعدد معاہدوں کا ثبوت ملتا ہے۔ جن میں آپ ﷺ نے بطورِ اسلامی ریاست کے فرمانروا غیر مسلموں کو مکمل مذہبی آزادی دی۔ کسی اسلامی حکومت کے لیے وہ سب معاہدے اقلیتی امور کے قوانین کا ماخذ ہیں۔ عہد نبوی ﷺ میں غیر مسلم اقلیتوں کی مذہبی آزادی اور ان کے عبادت خانوں کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے۔[1]

نبی کریم ﷺ کی زندگی میں رواداری کی جو مثالیں ملتی ہیں، وہ انسانی تاریخ میں کسی اور فرد کی زندگی میں نہیں ملتیں۔ جن لوگوں نے رسول ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کو اپنا وطن اور اپنے گھر بار چھوڑنے پر مجبور کیا تھا، جو لوگ ہمیشہ جسمانی اور ذہنی تکلیف پہنچاتے رہے۔ فتح مکہ کے دن، ان کے لیے نبی کریم ﷺ کے یہ الفاظ تھے۔ "آج تم پر کوئی گرفت نہیں" کا اعلان کیا جارہا ہے۔اہلِ مکہ جنہوں نے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے کنبہ کے لوگوں کو شعب ابی طالب میں محصور کر دیا تھا اور کئی سال تک رابطہ منقطع کیے رکھا تھا۔ مگر جب اہلِ مکہ قحط سالی کا شکار ہوئے تو آپ ﷺ سے ان کی غذائی قلت کی تکلیف برداشت نہیں ہوئی۔ آپ ﷺ نے اونٹ لاد لاد کر انہیں مدینہ منورہ سے غذائی امداد مہیا فرمائی۔ کوئی غیر مسلم بھی اگر بیمار ہو جاتا تو آپ ﷺ اس کی عیادت کی لیے تشریف لے جاتے۔[2]

---

[1] محمد حمید اللہ، **اسلامی ریاست**، ص56۔

[2] اشرفی، **رواداری سیرت طیبہ کی روشنی میں**، ص35۔

((حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ عُقَيْلٍ عَنْ ابْنِ شِهَابٍ أَنَّ سَالِمًا أَخْبَرَهُ أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَخْبَرَهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ وَمَنْ كَانَ فِي حَاجَةِ أَخِيهِ كَانَ اللَّهُ فِي حَاجَتِهِ وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللَّهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرُبَاتِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))[1]

سالم نے اپنے والد سے روایت کی، کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے، نہ اسے (ظالموں کے) سپرد کرتا ہے۔ جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی حاجت روائی فرماتا ہے۔ جو کسی مسلمان سے اس کی ایک تکلیف دور کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کی تکلیفوں میں سے ایک تکلیف دور کرتا ہے۔ جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس (کے عیبوں) کی پردہ پوشی فرمائے گا۔''

اسوہ حسنہ اور رواداری

عہد نبوی ﷺ اور خلفاء راشدین کے زمانے میں بھی اس بات کے قوی شواہد ہیں کہ کسی غیر مسلم کو جبری طور پر مسلمان نہیں بنایا گیا۔ ہر مذہبی کمیونٹی کو مکمل داخلی خود مختاری دی گئی تھی حتیٰ کہ نہ صرف عقائد کی آزادی تھی بلکہ مروجہ طریقوں سے عبادت کی بھی مکمل آزادی تھی۔ اس کے علاوہ اپنے مذہبی قوانین، اپنے ہی ججوں کے ذریعہ سے اپنے مقدمات کا فیصلہ بھی کروانے کی آزادی تھی۔ عہد نبوی ﷺ میں قومی خود مختاری ساری آبادی کے ہر گروہ کو مل گئی تھی۔ جس طرح مسلمان اپنے دین، عبادات، قانونی معاملات اور دیگر کاموں میں آزاد تھے، اسی طرح دوسری ملت کے لوگوں کو بھی آزادی تھی۔

627ء کے میں نبی کریم ﷺ نے کوہ سنائی کے قریب واقع راہب خانہ سینٹ کتھرین کے راہبوں کو بلکہ سارے عیسائیوں کو ایک سند نامہ حقوق عطا فرمایا جس کے بارے میں کہا گیا ہے۔ کہ یہ سند نامہ دنیا کی تاریخی روشن خیالی اور رواداری کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ اس دستاویز کی رو سے عیسائیوں کو چند ایسی مراعات حاصل ہوئیں جو انھیں اپنے مذہب حکمرانوں کے تحت بھی نصیب نہ ہوئی تھیں۔ نبی کریم ﷺ نے اعلان کر دیا کہ اس دستاویز میں جو احکام مندرج ہیں، اگر کوئی مسلمان ان کی خلاف ورزی کرے گا یا ان سے ناجائز فائدہ اُٹھائے گا تو اسے معاہدہ الہیٰ سے

---

[1] القشیری، **الجامع صحیح**، كِتَابُ الْبِرِّ وَالصِّلَةِ وَالْآدَابِ، بَابُ النَّهْيِ عَنِ الْإِشَارَةِ بِالسِّلَاحِ إِلَى مُسْلِمٍ، ح2442۔

رو گردانی کرنے والا، اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والا اور اس کے دین کی تذلیل کرنے والا تصور کیا جائے گا۔ آپ ﷺ نے عیسائیوں کی حفاظت، ان کے گرجاؤں اور ان کے پادریوں کے مکانوں کی پاسبانی اور انھیں ہر طرح کے گزند سے بچانے کی ذمہ داری اپنی ذات پر بھی اور اپنے متبعین پر بھی عائد کی۔ ان پر کوئی ناجائز ٹیکس نہ لگائے جائیں گئے۔ ان کا کوئی پادری اپنے علاقے سے نہ نکالا جائے گا۔ کسی عیسائی کو اپنا مذہب ترک کرنے پر مجبور نہ کیا جائے گا۔ اگر مسلمان کسی بیرونی عیسائی طاقت سے بر سر جنگ ہوں گئے تو مسلمانوں کے حدود کے اندر رہنے والے کسی عیسائی سے اس کے مذہب کی بناء پر حقارت کا برتاؤ نہ کیا جائے گا۔ اگر کوئی مسلمان کسی عیسائی سے ایسا برتاؤ کرے گا تو وہ رسول ﷺ کی نافرمانی کا مرتکب تصور ہو گا۔ کسی راہب کو اس کے راہب خانے سے خارج نہ کیا جائے گا۔[1]

((حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ حَدَّثَنَا هُشَيْمٌ أَخْبَرَنَا عُبَيْدُ اللَّهِ بْنُ أَبِي بَكْرِ بْنِ أَنَسٍ وَحُمَيْدٌ الطَّوِيلُ سَمِعَ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ يَقُولُ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ انْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا))[2]

''حضرت انسؓ سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''تم اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔''

مندرجہ بالا سطور سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ نے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ غیر مسلموں کو بھی پوری آزادی دی اور انہیں اسی طرح رہنے کا حق دیا جس طرح مسلمانوں کو دیا۔ کسی پر بھی کوئی جبر نہیں کیا کہ وہ اسلام قبول کریں بلکہ ایسا طرزِ عمل اپنایا جس کو دیکھ کر غیر مسلم خود بخود دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

اس طرز عمل کی روشن مثال ہمیں غزوہ اُحد میں دیکھائی دی جس نے نبی کریم ﷺ کے سب سے پیارے اور محبوب چچا حضرت حمزہ کو شہید کیا، اس کا نام وحشی تھا۔ فتح مکہ کے بعد جب نبی کریم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا تو نبی کریم ﷺ یہ نہیں فرمایا کہ اس کو قتل کر دو بلکہ یہ فرمایا اسے رہنے دو اس کچھ نہ کہو، ایک آدمی کا مشرف باسلام ہونا مجھے اس بات سے بہت عزیز ہے کہ میں ایک ہزار کفار کو تہ تیغ کر دوں۔ یہ عمل دیکھ کر وحشی نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔[3]

---

[1] ثانی، محمد حافظ، **رسول اکرم ﷺ اور رواداری** (کراچی: فضلی لمیٹڈ، 1998)، ص 61-68۔

[2] البخاري، **الجامع الصحيح**، كِتَابُ المَظَالِمِ وَالغَصْبِ، بَابٌ أَعِنْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا، ح2443۔

[3] الازھری، محمد کرم شاہ، **ضیاء النبی ﷺ**، ج سوم، (لاہور: ضیاالقرآن پبلی کیشنز، 2015)، ص 490۔

نبی کریم ﷺ نے اسلام کی تبلیغ اپنے عمل سے بھی کی ،آپ ﷺ نے عدل و انصاف ،مساوات اور رواداری کو فروغ دیااور اپنے حسنِ سلوک سے اپنے دشمنوں کے دل میں بھی اپنا گھر بنالیا۔ نبی کریم ﷺ نے ہر اُس شخص کو معاف کیا جس نے آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے صحابہ کو اور آپ ﷺ کے اہلِ بیت کو ایذا پہنچائی۔ آپ ﷺ نے اپنے عمل سے اس بات کا ثبوت دے دیا کہ آپ ﷺ کو رحمت اللعالمین بنا کر مبعوث کیا ہے اور اس رحمت سے ہر ایک مستفید ہوا، کیونکہ عرب کے لوگوں جس طرح اسلام کی طرف راغب ہوئے نبی کریم ﷺ کے حسنِ عمل کا نتیجہ تھااور وہ ایک رواداری کی اعلیٰ مثال تھی۔ جو رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔

میثاقِ مدینہ مذہبی رواداری کی اساس

اسلام نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اجنبیت کی دیوار کو گرانے کی مکمل کوشش کی ہے کیونکہ وہ غیر مسلموں سے تعلقات کو سماجی، معاشرتی اور معاشی ضرورت سمجھتا ہے۔ اگر غیر مسلم سے خونی رشتہ اور خاندانی تعلق ہو تو اسے وہ خاص اہمیت دیتا ہے۔ یہ تعلیمات صاف بتاتی ہیں کہ اسلام پر سختی سے قائم رہتے ہوئے اور اس کے احکام کی پوری طرح پابندی کرتے ہوئے دوسرے مذاہب کے افراد سے انتہائی شریفانہ روابط رکھے جاسکتے ہیں اور رکھے جانے چاہیں۔ یہ دین داری کے منافی نہیں بلکہ اس اسکی ہدایت کے مطابق ہے۔ ہجرت مدینہ سے مسلم مملکت کا ایک باب شروع ہوا۔ جس کی وجہ سے قبائلی عصبیت کا خاتمہ ہونے کے ساتھ ساتھ عالمگیری برداری کا قیام عمل میں آیا۔

میثاقِ مدینہ مذہبی رواداری اور غیر مسلموں سے تعلقات کی اساس فراہم کرنے میں مسلمانوں کے لیے نہایت معاون ثابت ہوا۔ فتح مکہ، میثاق مدینہ سے بھی بڑھ کر رواداری، عفو در گزر اور احسان کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جس میں نبی کریم ﷺ نے اپنے اور دشمنانِ اسلام کو مکمل فراخ دلی سے معاف کیا۔ اس کے علاوہ معاہدہ نجران اور اس قسم کے دوسرے معاہدے مذہبی رواداری، انسان دوستی اور غیر مسلموں کے مذہبی وانسانی حقوق کے عظیم رہبر ہیں۔ غیر مسلموں کے دلوں کو پیار محبت، رواداری، عفو و در گزر اور احسان سے جیتنے کا کوئی بھی موقع اسلام نے

اپنے ہاتھوں سے ضائع نہیں کیا۔ پیار و محبت اور احسان و رواداری جیسے عظیم ہتھیاروں کو استعمال کر کے ان گنت غیر مسلموں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا گیا۔[1]

یثرب ایک کثیر الاجناس آبادی کا شہر تھا۔ وہاں مختلف مذاہب رائج تھے، یہودی اس شہر میں حکومت کر رہے تھے۔ لیکن پانچویں صدی عیسوی کے بعد وہ اس و خزرج کے ساتھ مل کر یہاں حکومت کر رہے تھے۔ یہ قبائل جنوبی عرب سے منتقل ہو کر آئے تھے۔ یہودی اپنے مذہب پر نازاں تھے کہ وہ اہلِ کتاب ہیں۔ اُن کی معیشت بھی ٹھوس بنیادوں پر استوار تھی۔ ان کی بستیاں دور دراز تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہودی ایک طرف تو اوس و خزرج کو قرضے دے کر سود در سود وصول کرتے اور اس طرح اُن کی اقتصادی حالت کو دگرگوں بناتے تو دوسری طرف انہوں نے دسیہ کاری کا ایک جال پھیلا رکھا تھا۔ اسکا حاصل جنگِ بعاث تھی، جس میں پانی کی طرح خون بہایا گیا۔ اوس کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، لیکن خزرج سے بھی بڑھ کر فائدہ یہودیوں کو ہوا، دونوں قبیلوں نے اپنے ماضی پر نگاہ ڈالی اور اس احساس کے زیر اثر انہوں نے ایک حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُن کی نگاہیں عبداللہ بن ابی سلول کی طرف اُٹھیں جسے وہاں کا حلقہ معتبر سمجھتا تھا۔ اس بات کی تیاری ہو رہی تھی، کہ اُسے یثرب کا بادشاہ بنا دیا جائے۔[2]

ان حالات میں محمد عربی ﷺ یثرب میں قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر آپ ﷺ نے وہاں یہ ضرورتیں محسوس کیں کہ اپنے اور مقامی باشندوں کے حقوق و فرائض کا تعین مہاجرین کے توطن کا بندوبست مدینہ کے غیر مسلموں خاص کر یہودیوں سے سمجھوتہ مدینہ کی سیاسی تنظیم اور فوجی مدافعت کا اہتمام قریش سے مہاجرین کو پہنچے ہوئے جانی و مالی نقصانات کا بدلہ لینا۔ ان تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ ﷺ نے مدینہ میں اپنی آمد کے چند ماہ بعد 1ھ میں ایک نوشتہ مرتب فرمایا جسے مدینہ کے لوگوں نے تسلیم کیا یہ معاہدہ طرفین کی رفاہیت اور حقوق کی نگہبانی میں جامعیت کے اعتبار سے تاریخ کا اہم ترین باب ہے۔[3]

نبی کریم ﷺ نے مذہبی رواداری کی محض تلقین ہی نہیں فرمائی بلکہ اسے قانون اور اسلامی مملکت کے دستور کے مطابق تمام مفتوحہ قوموں اور غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ مذہبی رواداری کے ساتھ ساتھ انہیں مذہبی آزادی کی ضمانت بھی فراہم کی گئی، ان کے جان و مال، عزت و آبرو اور عقیدہ مذہب کا جس قدر تحفظ کیا گیا تاریخ میں

---

[1] ثانی، **رسول اکرم ﷺ اور رواداری**، ص 91۔

[2] الازھری، **ضیاء النبی ﷺ**، ج دوم، ص 250۔

[3] قریشی، محمد صدیق، **رسول ﷺ کی سیاستِ خارجہ**، (نئی دہلی: تاج پرنٹرز نجف گڑھ روڈ نئی دہلی، 1985ء) ص 45۔

اس کی مثال نہیں ملتی۔ نبی کریم ﷺ نے ریاست مدینہ کی بنیاد جن نکات پر رکھی اُن میں زندگی کے ہر پہلو کو ذکر کیا، لیکن یہاں پر ہم ان نکات کا ذکر کریں گئے جو مذہبی رواداری پر مشتمل ہوں گے۔

''هذا كتاب من محمد النبي(رسول الله)بين المومنين والمسلمين من قريش (واهل) يثرب ومن تبعهم فلحق بهم وجاهد معهم''[1]

یہ تحریری دستاویز ہے اللہ کے نبی محمد ﷺ کی قریش، یثرب کے اہل ایمان اور ان لوگوں کی بابت میں جو ان کے اتباع میں ان کے ساتھ شامل ہوں اور ان کے ہمراہ جنگ میں حصہ لیں۔

''المهاجرون من قريش على ربعتهم يتعاقلون بينهم وهم يفدون عانيهم بالمعروف والقسط بين المؤمنين''

مہاجرین جو قریش میں سے ہیں علیٰ حالہ دیتوں اور خون بہا وغیرہ کے معاملات میں اپنے قبیلہ کے طے شدہ رواج پر عمل کریں گئے۔اپنے قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑائیں گے اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ عدل وانصاف کا برتاؤ کریں گے۔

''وانه من تبعنامن يهود فان له النصر والاسوة غيرمظلومين ولا متناصرعليهم''

(یہودیوں میں سے جو بھی ہمارا اتباع کرے گا تو اسے مدد اور مساوات حاصل ہو گی اور ان یہود پر نہ تو ظلم کیا جائے گا اور نہ ہی ان کے خلاف کسی دشمن کی مدد کی جائے گی)

''و ان يهود بنى عوف امة مع المومنين،لليهود دينهم وللمسلمين دينهم، مواليهم وانفسهم الامن ظلم او اثم، فانه لا يوتغ الا نفسه واهل بيته''

اور یہود بنی عوف ،اور ان کے اپنے حلفاء و موالی، سب مل کر مسلمانوں کے ساتھ ایک جماعت (فریق) تصور ہوں گے۔یہودی اپنے دین پر (رہنے کے مجاز) ہوں گے اور مومن اپنے دین پر کار بند رہیں گے، البتہ جس نے ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کیا تو وہ محض اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو مصیبت میں ڈالے گا۔

---

[1] حمید اللہ، **سیاسی وثیقہ جات**، مترجم، ابو یحیٰی امام خاں (لاہور: مجلس ترقی ادب کلب روڈ، 2005)، ص 113-109۔

''وان علی الیھود نفقتھم، وعلی المسلمین نفقتھم، وان بینھم النصرعلی من حارب اھل ھذہ الصحیفتہ، وان بینھم النصح والنصیحۃ والبردون الا ثم''

اور یہودیوں پر ان کے مصارف کا بار ہو گا اور مسلمانوں پر ان کے مصارف کا اور اس صحیفہ والوں کے خلاف جو بھی جنگ کرے گا تو تمام فریق (یہودی اور مسلمان) ایک دوسرے کی مدد کرے گے۔ نیز خلوص کے ساتھ ایک دوسرے کی غیر خواہی کریں گے اور ان کا شیوہ وفاداری ہو گا نہ کہ عہد شکنی۔

''وانہ لا یاثم امر، بحلیفہ، وان النصرللمظلوم''

اور ہر مظلوم کی بہر حال حمایت و مدد کی جائے گی۔

''وان بینھم النصرعلی من، دھم یثرب''

اور یثرب (مدینہ) پر جو بھی حملہ آور اس کے مقابلے میں یہ سب (یہودی اور مسلمان) ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

''واذا دعوا الی صلح یصالحونہ و یلبسونہ فانھم یصالحونہ و یلبسونہ،و انھم اذا دعوا الی مثل ذلک، فانہ لھم علی المومنین الا من حارب فی الدین''[1]

ان مسلمانوں میں جو اپنے حلیف کے ساتھ صلح کرنے کے لیے یہود کو دعوت دے تو یہود اس سے صلح کر لیں، اسی طرح اگر وہ (یہود) کسی ایسی صلح کی دعوت دیں تو مومنین بھی اس دعوت کو قبول کر لیں گے، الا یہ کہ کوئی دین و مذہب کے لیے جنگ کرے۔

مندرجہ بالا معاہدہ اور اس کی دفعات اپنی حقیقت پر آب گواہ ہیں۔ امن و سلامتی، آزادی اور انصاف کا ہر جوہر اس میں موجود ہے۔ یہ معاہدہ اُن لوگوں کے ساتھ کیا گیا جو قرآن کی زبان میں ظلم اور گناہ کی راہ میں تیز رو تھے۔ جھوٹ کے عادی، سود خوری، سرمایہ دار، غریبوں کا مال ناحق ہضم کرنے والے تھے۔ نبی کریم ﷺ کے اس انقلابی اقدام سے پہلے بے شمار قومیں زمین پر آباد تھیں۔ لیکن ان کے سیاسی اور معاشرتی اتحاد کی اساس زبان، رنگ، نسل یا وطن تھی۔ انسانی معاشرہ کی بربادی کے جو عناصر تھے۔ نبی کریم ﷺ نے اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے لیے

---

[1] حمید اللہ، محمد، **الوثائق السیاسیہ** (بیروت: دار النفاس، 1985)، ص59۔

ان بنیادوں میں سے کسی بنیاد کو استعمال نہیں کیا، بلکہ رنگ، نسل، زبان اور وطن کے تمام امتیازات اور ان سے پیدا ہونے والی ہر قسم کی عصبیتوں کو باطل قرار دے دیا اور اپنی امت کے اتحاد کی بنیاد فقط دین اور عقیدہ قرار دیا۔ جو بھی اسلام قبول کرتا ہے چاہیے وہ عربی ہو یا عجمی، شرقی ہو یا غربی، اسود ہو یا ابیض، امیر ہو یا غریب کوئی بھی زبان بولتا ہو وہ اس معاشرے کا فرد بن سکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حکمتِ نبوی سے ان تمام مسائل کو پوری کامیابی سے اس طرح حل کیا۔ اہل اسلام کو رنگ و نسل کے امتیازات سے بالا تر کر کے انہیں رشتہ اخوت میں منسلک کیا اور ایسی نئی ملت تیار کی جو خالص دینی اور انسانی اقدار پر مبنی تھی: اسے ایک اللہ، اور اس کے رسول ﷺ، ایک قبیلے اور ایک ہی مقصد زندگی سے وابستہ کر دیا۔ مسلمانوں کی روحانی و معاشرتی تربیت و اصلاح اور ان میں مرکزیت پیدا کرنے کے لیے مسجد نبوی کی تعمیر کی اور اسے اہل اسلام کی روحانی، سماجی، تعلیمی و عدالتی سرگرمیوں کا مرکز و محور قرار دیا۔ مدینے میں بسنے والے مختلف گروہوں کے باہمی تعلقات اور حقوق و فرائض کو متعین کیا، اس شہر کی سیاسی تنظیم اور تحفظ و دفاع کے لیے ایک ایسا معاہدہ کیا ہے جسے میثاقِ مدینہ کہا جاتا ہے۔[1]

میثاقِ مدینہ کی تاریخی، مذہبی سیاسی اور قانونی اہمیت

میثاقِ مدینہ کے مطالعہ کرنے کے بعد اس معاہدے کی اہمیت و عظمت کے بارے میں جو اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں وہ یہ ہیں۔ اس معاہدے کی بدولت مدینہ کی شہری ریاست کا آغاز ہوا اور نبی کریم ﷺ مخالفین و لواحقین دونوں کی طرف سے اس ریاست کے سربراہ تسلیم کر لیے گئے اور اس طرح آپ ﷺ ایک بین الاقوامی معاشرہ تشکیل دینے میں مصروف ہو گے۔ اس معاہدے کی بدولت نبی کریم ﷺ مختلف خیال اور مختلف العقیدہ اور آپس میں منتشر لوگوں کو متحد کرنے کا کام بڑی مہارت سے سرانجام دیا۔ آپ ﷺ ایک ایسی ریاست اور ایک معاشرے کا آغاز کرنے میں کامیاب ہو گے جو بین الاقوامیت کے اصول پر مبنی تھا۔ اس میثاق کی بدولت نبی کریم ﷺ نے عدالتی، تشریعی فوجی اور تنفیذی اختیارات اپنے اور اہل اسلام کے لیے محفوظ کر لی۔

نبی کریم ﷺ نے سیاست میں اخلاقی عناصر کو داخل کیا، اصل سرچشمہ اقتدار اللہ تعالیٰ کو قرار دیا اور خود اللہ تعالیٰ کے نائب کی حیثیت اختیار کی۔ شہریت، تنظیم حکومت سیاسی رواداری، فراست اور اسلامی حکمت عملی کا عمدہ اظہار

---

[1] غزنوی، محمد داود، **اسلامی ریاست کے اساسی اصول و تصورات**، (لاہور: مکتبہ نذیریہ، 1986) ص 38۔

بھی اسی معاہدے کے ذریعے ہوا۔اسی معاہدے کی بدولت مذہبی آزادی کا اصول وضع ہوا، نیز جن بنیادوں غیر مسلموں سے اتحاد ہو سکتا ہے ان کی نشاندہی ہوئی۔اسی معاہدے نے اہلِ اسلام کے باہمی حقوق و فرائض اور جملہ شہریوں کے آپس کے تعلقات اور حقوق و فرائض کا تعین کیا۔اسی معاہدے نے ظلم ناانصافی، عدم مساوات اور ایسی ہی دیگر خرابیوں کا سدباب کیا۔ عربوں کے قتل کا بدلہ لینے کا پرانا انفرادی طریقہ ختم کر کے اسے اجتماعی فریضہ قرار دیا، کمزروں ناداروں اور مظلوموں کی دادرسی کا پورا پورا اہتمام بھی اسی معاہدے کی رو سے ہوا۔ حالتِ امن اور حالتِ جنگ کا لائحہ عمل مرتب ہوا۔ یہ معاہدہ قریش کے خلاف ایک مشترکہ اتحاد بن گیا اور دشمنان اسلام کا داخلہ مدینہ میں بند کر دیا گیا۔ مدینہ کو حرم قرار دیا گیا۔یوں اسی نئی شہری ریاست کی حرمت قائم ہوئی۔اس کے داخلی امن اور تحفظ و دفاع کا خاطر خواہ انتظام ہوا۔ قبائل کی باہمی خانہ جنگی کا انسداد بھی اسی معاہدے کی بدولت ہوا۔اسی معاہدے نے شہریوں کے اندر قانون، اخلاق، مذہب اور انسانی قدروں کے احترام کا بھرپور جذبہ پیدا کیا۔ نبی کریم ﷺ کے جاری کردہ اسی نظام کی بدولت ایک مضبوط اسلامی ریاست اور صالح معاشرہ معرض وجود میں آیا۔[1]

میثاقِ مدینہ محض میثاق نہیں بلکہ یہ ایک دستور ہے، جو کہ تحریری ہے۔ مدینہ میں مختلف قبائل آباد تھے۔اس لیے ہر قبیلہ ایک جگہ ہی رہتا تھا۔ ہر محلے میں مختلف قبیلے رہتے تھے۔انصار اس تقسیم کو پہلے ہی جانتے تھے لیکن مہاجرین اس سے بے خبر تھے۔ چنانچہ عدالتی و معاشرتی مقاصد کے لیے مہاجرین کو ایک قبیلہ قرار دیا۔اس دستور نے مدینہ کو حرم قرار دیا۔ مذہبی لحاظ سے وہاں کو خونریزی کی ممانعت ہو گئی، فریقین اس پر رضامند ہو گئے۔ سیاسی لحاظ سے اس دستور نے حرم کی حدود میں رہنے والوں کو ایک جماعت قرار دیا، جس پر حکومت کے تمام قوانین عائد ہوتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہودیوں سے ایک نیم عرب شہر کو حرم منوالینا نبی کریم ﷺ کا ایک سیاسی کارنامہ تھا۔اس لیے یہودیوں نے یہاں تک منظور کر لیا کہ آپ ﷺ ہی اُن کے لیے سپریم کوٹ کے فرائض بھی انجام دیں آپ ﷺ اُن کے مقدمات کا فیصلہ اُن کے شخصی قانون کے مطابق ہی کرتے تھے۔

[1] ثانی، رسول اکرم ﷺ اور رواداری، ص 96۔

فتح مکہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کی فاتحانہ رواداری

یوں تو آپ ﷺ کی پوری حیاتِ مبارکہ کفار و مشرکین اور مخالف مذہب دشمنوں سے حسنِ سلوک، عفو و درگزر اور مثالی مذہبی رواداری سے بھری پڑی ہے۔ لیکن اس کا ایک اہم اور تاریخ ساز موقعہ ''فتح مکہ'' 10 رمضان 8ھ بمطابق جنوری 630ء ہے، کہ جب آپ ﷺ کو اپنے دشمن پر مکمل اختیار حاصل تھا۔ جب صحنِ کعبہ میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ اور جانثارانِ اسلام کے دشمن گروہ در گروہ سر جھکائے کھڑے تھے۔ یہ وہ دشمن تھے، جنہوں نے جگر گوشۂ رسول کا حمل اپنے نیزوں سے گرایا، جنہوں نے داعی اسلام ﷺ کے سر مبارک کو شانہ مقدس سے جدا کرنے میں کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ جنہوں نے ہر موقع پر نبی کریم ﷺ کو (نعوذ باللہ) بدنام کرنے اور اذیت پہنچانے میں کوئی دریغ نہیں کیا، جن کے دل و دماغ کی تمام قوتیں اسلام کی بیخ کنی میں درکار ہوتی تھیں۔ لیکن دنیا نے دیکھا کہ نبیِ رحمت ﷺ نے ان دشمنوں کے ساتھ عین اس وقت کہ جب وہ مفتوح تھے، قیدی تھے، زیر دست تھے، ان میں مقابلے کی تاب نہ تھی، وہ بے بس تھے، بے کس تھے اور جب یہ صدا بلند ہوئی، آج تو جنگ و جدال، اور قتال و انتقام کا دن ہے۔ آج تو خونریزی اور بدلہ لینے کا دن ہے۔ اس موقع پر نبیِ رحمت ﷺ نے جس عفو و درگزر اور مذہبی رواداری کا وہ شاندار نمونہ پیش کیا، اس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ قریش نے خود ہی صلح حدیبیہ کی شرائط توڑ ڈالیں۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے حلیف بنو خزاعہ کے خلاف بنو بکر کی مدد کی، اور بنو خزاعہ کے بیس آدمی قتل کر ڈالے۔ ادھر عمرو بن سالم خزاعی چالیس سوار لے کر رسول ﷺ کی خدمت میں مدینہ منورہ حاضر ہوا۔ اس نے آپ ﷺ سے مدد طلب کی لہذا آپ ﷺ دس ہزار آدمی کے کر مکہ کی طرف چلے، اور عظیم فتح حاصل ہوئی، بت توڑے گئے اور مکہ مکرمہ کی فضاؤں میں کلمہ توحید گونجنے لگا۔[1]

نبی کریم ﷺ کعبہ کو بتوں سے پاک کرنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ اس لیے نبی کریم ﷺ 10 رمضان المبارک 8ھ کو مکہ کی طرف بڑھے۔ دس ہزار مسلح جاں نثار ساتھ تھے۔ مرالظہران میں جو مکہ سے ایک میل کی مسافت پر تھا، محمدی لشکر نے ادھر پڑاؤ ڈالا۔ آپ ﷺ کے ارشاد کے مطابق تمام فوج نے الگ الگ آگ جلائی جس سے تمام صحرا روشن ہو گیا۔ قریش کو بھی خبر پہنچی تو انہوں نے مزید حالات کا جائزہ لینے کے لیے حکیم بن حزام، ابو

[1] قادری، محمد طاہر، **سیرۃ الرسول ﷺ** (لاہور: منہاج القرآن پبلی کیشنز، 2015)، ص220۔

سفیان اور ورقاء کو روانہ کیا۔ خیمہ نبوی کے محافظ دستہ نے انہیں گرفتار کر کے بارگاہ رسالت میں پیش کر دیا۔ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا اب تو کفر کے استیصال کا وقت آ گیا ہے، مگر حضرت عباسؓ نے ان کی جان بخشی کی درخواست کی جس کو نبی کریم ﷺ نے نہایت فراخ دلی سے ابو سفیان کو معاف کر دیا، یہ طرزِ عمل دیکھ کر فوراً دائرہ اسلام میں داخل ہو گے۔[1]

اسی موقع پر نبی کریم ﷺ نے اپنے جانثاروں سے ارشاد فرمایا، کہ جب تک کوئی شخص حملہ آور نہ ہو اس پر تلوار نہ اُٹھائی جائے۔ جو شخص ہتھیار ڈال دے اسے قتل نہ کیا جائے۔ جو شخص ابو سفیان کے گھر میں چلا جائے اس کو امان ہے، اور اسی طرح جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کر دے اس پر چڑھائی نہ کی جائے۔ اور جو شخص بھاگ جائے اس کا تعاقب نہ کیا جائے۔ یہ ہدایات جاری کرنے کے بعد نبی کریم ﷺ نے ایک خطبہ دیا جس میں عام معافی کا اعلان کر کے اپنے دشمنوں کو اپنا اسیر بنا لیا۔ آپ ﷺ کا یہ طرزِ عمل دیکھ کر یہ سب لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

ملک یمامہ کا ایک سردار ثمامہ بن اثال مشرف بہ اسلام ہوا تو اس نے اپنے ملک میں جا کر قریش مکہ کی طرف غلہ جانا بند کر دیا۔ مکہ والوں کو شدید قلت کی وجہ سے بہت سی مشکلات اُٹھانی پڑی۔ جب نبی کریم ﷺ کو اس بات کی اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے فوراً ثمامہ بن اثال کو حکم دیا کہ فوراً اناج کا غلہ مہیا کیا جائے۔ اسی طرح عکرمہ جس نے بے وجہ حملہ کر کے دو بے گناہ مسلمانوں کو قتل کر دیا تھا۔ اس کے بدلے عکرمہ کو سزا ملنی تھی وہ یہ خبر سن کر بھاگ گیا، اور مکہ میں اس کے بچے اور بیوی لاوارث ہو گئے۔ اس حالت میں عکرمہ کی بیوی نبی کریم ﷺ کے پاس آئی اور اپنی پریشانی بیان کی، نبی کریم ﷺ نے پہلے مقتولوں کے وارثوں کو خون کی معافی کے لیے رضامند کیا۔ پھر عکرمہ کی بیوی کو اطلاع دی کہ عکرمہ کی جان بخش دی گئی ہے۔ تب وہ اپنے شوہر کی تلاش میں نکلی اور اسے ڈھونڈ کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر لائی، عکرمہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہوئے اپنی بیوی کو بطور سفارشی لایا۔ یہ وہ شخص تھا جس کا باپ نبی کریم ﷺ کی جان کا دشمن تھا۔ جب اس نے سچے دل سے اسلام قبول کر لیا تو نبی کریم ﷺ سے اس کو معاف کر کے اپنے اعلیٰ اخلاق اور بے مثال رواداری کا ثبوت دیا۔[2]

---

[1] ایضاً، ص326۔

[2] ایضا۔ ص326۔

جب ہبار کو نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں لایا گیا، اور یہ وہ شخص تھا۔ جس نے نبی کریم ﷺ کی صا حبزادی حضرت زینبؓ کو پتھر مارے تھے، جب وہ مکہ سے تشریف لا رہی تھی اور حضرت زینبؓ حمل سے تھی اس حالت میں آپؓ کو شدید ضربات آئی جب وہ مدینہ آئی اور وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے انتقال کر گئی۔ ہر شخص کو اس کا یقین تھا کہ یہ شخص حضرت زینبؓ کے قصاص میں قتل کر دیا جائے گا، لیکن نبی کریم ﷺ نے اس کو بھی بڑی دیار دلی سے معاف کر دیا۔[1]

نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر ہر اس شخص کو معاف کر دیا جس نے نبی کریم ﷺ کو، ان کے اہلِ خانہ کو اور ان کے اصحاب کو تکلیف دی یا قتل کیا۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ کو جس نے قتل کیا، وحشی اس کو بھی نبی کریم ﷺ نے معاف کر دیا۔ اور اسی طرح نبی کریم ﷺ نے ہندہ کو جو ابو سفیانؓ کی زوجہ تھی اُس کو بھی معاف کر کے رواداری کی اعلیٰ مثال قائم کی۔

داعی اسلام نبی کریم ﷺ کو مصلحان عالم کی ایک بہت بڑی تعداد پر اس خصوصیت امتیازی میں ایک خاص شرف اور برتری حاصل ہے کہ آپ ﷺ کا قول و فعل یکساں تھا۔ دین اسلام امن و شانتی کا دین ہے اور نبی کریم ﷺ نے ہر موقع پر اس کو درست ثابت کر کے دکھایا۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے جانی دشمنوں سے بھی حتی الوسع رحم و کرم اور مروت و کریم النفسی کا سلوک کرنے کی مثالیں پیش کی ہیں۔

فتح مکہ کے سیاسی اثرات

مکہ فتح ہونے کے بعد قریش کا رعب و دبدبہ اور شان و شوکت ختم ہو گئی، عرب کے تمام قبائل اس انتظار میں تھے کہ قریش اور مسلمانوں میں سے کون سا فریق غالب اور فاتح بنتا ہے، تاکہ وہ بھی اس کی رفاقت اختیار کریں۔ 9ھ میں قبائل عرب کے نمائندہ وفود اس کثرت سے بارگاہ نبوت میں خاصر ہوئے کہ اس سال کا نام ہی "عام الوفود" مشہور ہو گیا۔ گویا کہ سارا عرب ہی نبی کریم ﷺ کے قدموں میں آکر گر گیا، اور اس طرح جو قوت اسلام کو ملی وہ قابل ذکر ہے۔[2]

---

[1] الازھری، ضیاء النبی ﷺ، ص 99۔

[2] الازھری، ضیاء النبی ﷺ ص 99۔

فتح مکہ کے مذہبی اثرات

فتح مکہ کے دن مذہبی رواداری کے بہت سے فوائد ہوئے جن میں سے اہم درج ذیل ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے جب عام عفو ودر گزر کا اعلان کیا تو اس سے بہت سے لوگوں کی جانیں محفوظ ہو گئی ،اور بہت سے لوگ قید ہونے سے محفوظ ہو گئے ،اور ان کے ساتھ دیگر مفتوحہ علاقے کے لوگوں کی طرح سلوک نہ کیا گیا۔ منقولہ اور غیر منقولہ جائیدادیں مالکوں کے پاس رہیں اور ان پر جزیہ نہ لگایا گیا۔ یہ سب مکہ مکرمہ کی حرمت کی وجہ سے کیا گیا۔ مکہ سے بتوں کا خاتمہ ہو گیا، لات، عزٰی اور منات جو ان کے آبائی بت تھے۔ ان کو توڑ دیا گیا اور مکہ کو خالص اللہ کے لیے پاک کیا گیا۔ نبی کریم ﷺ کی مذہبی رواداری سے اہلِ مکہ اتنے متاثر ہوئے کہ جب نبی کریم ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ اس سرزمین کو بتوں سے پاک کر دو تو انہوں نے بغیر کسی بحث کے آپ ﷺ کے حکم پر سر جھکا لیا۔ حالانکہ یہ وہی مکہ والے تھے جنہوں نے اپنے بتوں کی خاطر ابرہہ بادشاہ جیسے حکمرانوں سے بھی دشمنی مول لی تھی۔

نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر جس رحمدلی اور رواداری کا مظاہرہ کیا اُس سے مسلمان تو مسلمان غیر مسلم بھی اس قدر متاثر ہوئے کہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ نبی کریم ﷺ نے نہ صرف اہلِ مکہ کو ہی معاف نہ کیا بلکہ عیسائیوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کیا، حاتم طائی کے بیٹے عدی اپنے قبیلہ کے سردار اور مذہبا عیسائی تھے۔ جس زمانے میں اسلامی فوجیں یمن گئیں یہ بھاگ کر شام چلے گئے ،ان کی بہن گرفتار ہو کر مدینہ آئیں۔ نبی کریم ﷺ نے ان کو بڑی عزت کے ساتھ رخصت کیا، جب وہ اپنے بھائی کے پاس گئیں اور کہا کہ جس قدر جلد ہو سکے ، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں جاؤ۔ جب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو نبی کریم ﷺ سے اتنے متاثر ہوئے کہ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اس کے علاوہ نبی کریم ﷺ نے غزوہ ہوازن سے جو مالِ غنیمت حاصل ہوا وہ سب مکہ کے ان نو مسلموں میں تقسیم کر دیا تا کہ ان کے دلوں میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے بارے میں حسد اور نفرت ختم ہو ،اور ان کی روحیں اور ان کے دل اسلام اور پیغمبر اسلام کی محبت سے بھر جائیں۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے دشمنوں کو اپنے اخلاق اور عمل سے اس قدر متاثر کیا کہ وہ کلمہ توحید پڑھنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ تلواریں جو اسلام اور مسلمانوں پر آگ برسایا کرتی تھیں اب وہ اسلام کے علم کو بلند کرنے اور مسلمانوں کی عظمت کی حفاظت کے لیے استعمال ہونے لگی ،اور وہی لوگ اب

اپنے اموال اور اولاد کی قربانیاں دے کر کرنے لگے، اور اپنی جانیں اور روحیں اس پر قربان کرنے لگے۔ آپ ﷺ نے اپنے دشمنوں کو بھی کبھی اذیت نہیں دی اور ہمیشہ عفو و درگزر سے کام لیا اور مذہبی رواداری کا بہترین عملی نمونہ پیش کیا۔[1]

اہلِ نجران کے ساتھ معاہدے کے نکات اور رواداری:

نبی کریم ﷺ نے اہلِ نجران کے ساتھ جو معاہدہ کیا، اس میں اُن کی طرزِ زندگی کے ہر پہلو کو زیرِ بحث رکھا گیا تھا۔ لیکن ہم صرف اُن پہلو کو زیرِ قلم لائیں گئے، جو مذہبی رواداری پر مبنی ہو گی۔

''ولا راهب من رهبانيته، ولا كاهن من كهانته ولا بغير حق من حقوقهم ولا سلطانهم، ولا شْي مما كانوا عليه''[2]

ان کے پادریوں اور راہبوں کو ان کے طریقِ عبادت اور کاہنوں کو نہ ان کے پیشہ سے ہٹایا جائے گا نہ ان کے حقوق میں مداخلت کی جائے گی۔

''ولاهدم بيت من بيوت بيعهم، ولا إدخال شْى من بناْهم فى شيْ من أبنية المساجد، ولا منازل المسلمين''

ان کی عبادت گاہوں میں مداخلت نہ کروں گا، نہ انھیں مساجد میں تبدیل کروں گا اور نہ ہی انھیں مہمان سرائے کے طور پر استعمال کروں گا۔

''وألا يحمل الرهبان والا سا قفته، ولا من تعبد منهم، أو بس الصوف، أو توحد فى الجبال و المواضع المعتزلته عن الامصار شيْا من الجزيته أو الخراج''

ان کے علماء و زہاد اور مذہبی سربراہ خواہ کھلے میدان یا پہاڑوں میں ہوں ان پر سے جزیہ اور خراج دونوں معاف ہیں۔

''ولا يجبر أحد ممن كان على ملة النصرانيته كرها على الإسلام''

نصرانی کو مسلمان ہونے پر اکراہ نہ کیا جائے۔

''ولهم إن احتاجوا فى مرمة بيعهم و صوامعهم، أو شْى من مصالح أمورهم ودينهم، إلى رفد من المسلمين وتقوية لهم على مرمتها، أن ير فدوا على ذلك ويعاونوا ولا

---

[1] راشد ضیاء، **''غیر مسلموں کے ساتھ رواداری برتنا''** قومی ترجمان، 10 جنوری 2021۔

[2] حمید اللہ، **الوثائق السیاسیہ**، ص 100۔

يكون ذلك ديناً عليهم بل تقوية لهم على مصلحة دينهم ووفاء بعهد رسول الله موهبة لهم ومنة الله ورسوله عليهم"[1]

اگر وہ اپنی عبادت گاہوں اور خانقاہوں یا قومی عمارتوں کی مرمت کرنا چاہیں اور مسلمانوں سے مالی اور اخلاقی امداد کے طلب گار ہوں تو ان کی اعانت کرنا ہی چاہیے۔ یہ اعانت ان پر فرض اور احسان نہ ہو گی بلکہ اس میثاق کی تقویت ہو گی جو رسول ﷺ نے ازراہِ احسان و کرم ان سے کیا۔

نبی کریم ﷺ کی مصلحانہ کاوشوں اور غیر مسلم اقوام کے ساتھ معاہدوں کے انعقاد سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ آپ ﷺ دنیا میں امن و سلامتی کا قیام چاہتے تھے۔ جسے اپنوں اور غیروں نے یکساں تسلیم کیا ہے۔ان معاہدات سے ہمیں بین المذاہب رواداری، بین المذاہب مکالمہ کا جواز، دوسروں کے جائز مطالبات کا احترام، اقلیتوں کی مذہبی آزادی کے تحفظ، کا جواز ملتا ہے۔ اس سے ایک بات اور سامنے آتی ہے کی اسلامی حکومت کے ماتحت رہنے والے غیر مسلم رعایا کو مساوی قانونی حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ان کے ساتھ مذہب کے معاملے مین کوئی جبر نہیں کیا جائے،اور ان کے اموال، جانیں اور عزت کی حفاظت اسلامی حکومت کے ذمہ ہوتی ہیں۔ اپنے مذہبی عہدے دار وہ خود متعین کرنے کے مجاز ہیں اور انکی عبادت گاہیں قابلِ احترام ہیں۔

معاہدات نبوی اور مذہبی رواداری پر اس کے اثرات:

نبی کریم ﷺ نے جو بھی مذہبی رواداری کے لیے اقدامات اُٹھائے وہ مدینہ کے وقار میں اضافہ کا سبب بنے، وہاں ان کا مقصد معاشی طور پر قریش کو نقصان بھی پہنچانا تھا۔ان معاہدات میں ایک راز بھی مضمر تھا کہ حبشہ کی طرف قریش مدینہ میں بھی مسلمانوں کا تعاقب نہ کریں اور مسلمان مدینہ میں اتنی قوت حاصل کر لیں کہ خود قریش ان کے ساتھ معاہدہ کرنے پر مجبور ہو جائے،اور اس کے علاوہ مسلمان آزادی سے اپنی مذہبی عبادات انجام دے سکیں۔ان مذہبی معاہدات کا ایک مقصد یہ بھی تھا۔ کہ مدینہ کے ارد گرد کے یہودیوں کو متاثر کیا جاسکے جو میثاقِ مدینہ کے فریق ہونے کے باوجود کئی بار نقص عہد کر چکے تھے۔ وہ ہر وقت اوس اور خزرج میں فساد برپا کرنے میں مصروف رہتے تھے۔اُن کو یہ دیکھنا ضروری تھا کہ اب مدینہ میں مرکزی حکومت قائم ہو چکی تھی اس لیے ان کی سرکوبی کی جاسکتی تھی۔

---

[1] حمید اللہ، **الوثائق السیاسیہ**، ص100۔

نبی کریم ﷺ کا حسن سلوک اور رواداری ان کے ساتھ تھی جو مسلمانوں اور دینِ اسلام کے ساتھ دشمنی اور نفرت نہ کرتے ہو نبی کریم ﷺ نے غیر مسلمانوں سے مذہبی رواداری اور معاہدات کرنے میں مندرجہ ذیل باتوں کو مدِ نظر رکھا:

- اسلام کسی قوم یا گروہ سے ایسا کوئی معاہدہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا جس میں اسلام کی سربلندی پر کوئی حرف آئے۔
- اسلام کی نگاہ میں وہی معاہدہ درست ہو گا، جس کے طے کرنے میں فریقین کی آزادانہ خود مختاری اور سکونِ قلب ہو۔
- اسلام میں ایسا کوئی مذہبی رواداری پر مبنی معاہدہ قبول نہیں کیا جاسکتا جس سے کسی بھی طرح اسلام کی بے حرمتی کا پہلو نکلتا ہو، جیسے احکام الہیٰ کے خلاف فیصلوں کو جائز قرار دینا یا غیر مسلموں کو ایسے حقوق عطا کرنا جو مسلمانوں کے اختیاراتِ حکومت کے منافی ہوں۔
- جو معاہدات نبی کریم ﷺ نے ابتدائی زمانے میں کیں ان کا مقصد مذہبی رواداری تھا، اور جو بعد میں معاہدات کیں اُن کا مقصد سیاسی یا اقتصادی تھا۔
- نبی کریم ﷺ نے رواداری پر خاص زور دیا جو کسی آسمانی کتاب سے وابستگی کے مدعی تھے۔ آپ ﷺ کی رواداری کا اولین مقصد یہ تھا کہ تمام لوگ وحدانیت ربانی کا اقرار کریں۔ اہلِ کتاب پر ایمان رکھتے تھے۔ مگر آپ ﷺ پر نہیں، لیکن آپ ﷺ کے معاہدات کو تسلیم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ انہوں نے لقبِ رسالت منظور کیے بغیر آپ ﷺ کی آسمانی حیثیت کو قبول کیا ہے۔ نبی کریم ﷺ اس امید پر ان سے مصالحت کرتے کہ ان نیم مومنوں پر رواداری کا اثر اچھا ہو گا۔ اور آہستہ آہستہ وہ سچے مومن بن جائیں گئے۔[1]

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ نبی ﷺ نے مسلم اور غیر مسلم کا فرق کیے بغیر اسلام کی تبلیغ کی اور اسلام کی تعلیمات کو عام کیا اور جہاں پر آپ ﷺ نے ضرورت محسوس کی وہاں آپ ﷺ نے غیر مسلموں سے معاہدات کیں اور زندگی کے دیگر معاملات کو جاری رکھا اور ہمارے لیے ایک بہترین مثال کے طور پر اُس کو چھوڑا تاکہ ہمیں بھی غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کرتے دقت پیش نہ آئے۔ ہمارے مذہب میں دوسرے

[1] امجد پرویز، "**معاصر معاشرت میں سماجی رواداری کا حصول: سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں**"، القمر، جلد 2، شمارہ 1، (2019)، ص 8۔

مذاہب کی عزت کرنااور اُن کا خیال رکھنے کا حکم دیا گیا ہے کسی کی دل آزاری کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ نبی ﷺ نے بھی اسلام کی تبلیغ کی اور لوگوں پر جبر نہ کیا کہ دائرہ اسلام میں داخل ہو اور یہی اسلام کی بنیادی تعلیمات ہیں جن کا ہمیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے۔

فصل سوم: اسلام میں رواداری کے اصول وآداب

اسلام نے مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ معاشرتی، مذہبی و معاشی تعلقات جن حدود و قیود کے ساتھ قائم رکھنے کی اجازت دی ہے۔اسکا مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ کس طرح میل جول رکھا جائے تاکہ ان تک اسلام کا صحیح پیغام پہنچانے کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے غیر مسلموں کے ہدیہ قبول فرماتے اور انکی طرف ہدیہ بھی بھیجا کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ کا غیر مسلموں کے ہدیے قبول کرنااور انہیں ہدایا بھیجنے کا عمل دراصل مختلف مذاہب کے درمیان چھوت چھات کے عمل کو ختم کرنے اور رابطہ محبت استوار کرنے کے لیے تھا۔

نبی کریم ﷺ نے یہودیوں کو سرکاری زمینوں کے مزارعوں کی حیثیت سے خیبر میں رہنے کی اجازت دے دی۔ بنو عریض کے جو یہودی مدینہ منورہ میں رہ گئے تھے۔ان کے ساتھ بھی رحمدلی اور فیاضی کا سلوک کیا گیااور انہیں سالانہ وظائف جاری کئے گئے۔جب تک یہ لوگ خود امن پسند رہے کسی نے ان کے ساتھ جھگڑا نہیں کیا۔انہیں مذہبی قانونی وعدالتی اور اقتصادی معاملات میں مکمل آزادی وخود مختاری دی گئی جس سے وہ بہت خوشحال ہوئے۔

نبی کریم ﷺ نے غیر مسلموں کو بھی مسلمانوں جیسے حقوق دیے، مسلم اور غیر مسلم کی قصاص اور دیت برابر ادا کرنے کا حکم دیا۔ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کی ذمہ داری بھی اسلامی ریاست پر عائد کی کہ ان کی حفاظت کریں۔اسلامی حکومت کے ماتحت رہنے والے غیر مسلم رعایا کو مساوی قانونی حقوق دیے۔شریعت کی یہ حکمت ہے کہ غیر مسلموں کو ان کے مذہب ومسلک پر برقرار رہنے کی پوری آزادی ہو گی۔اسلامی مملکت ان کے عقیدہ وعبادت میں دخل اندازی نہیں دے گی۔ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں جن غیر مسلم قبائل نے غیر مسلم ہوتے ہوئے جزیرۃ العرب میں اسلامی حکومت کی رعایا کے طور پر رہنا پسند کیا، تو نبی کریم ﷺ نے ان کے ساتھ معاہدات کیں اور ان کو رہنے کی اجازت دی اور ان کے حقوق مسلم رعایا کی طرح مقرر کیں۔ جس طرح نبی کریم ﷺ نے غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک کیا اور اس کا حکم دیا اسی طرح نبی کریم ﷺ کے صحابہ اکرام نے بھی کیا۔ حضرت عمرؓ کے دورِ حکومت میں غیر مسلم شہریوں سے حسن سلوک کا یہ عالم تھا۔ کہ کمزور، معذور اور بوڑھے غیر مسلم شہریوں کا نہ صرف ٹیکس معاف کر دیا، بلکہ بیتِ المال سے ان کی اور ان کے اہلِ وعیال کی کفالت بھی کی جاتی تھی۔

اسلام میں رواداری کی حدود و قیود

قرآن مجید نے ایک عمومی اور اصولی ہدایت مسلمانوں کو دی ہے وہ یہ ہے کہ بین الاقوامی سطح پر جن قوموں سے تعلقات قائم کیے جائیں۔ وہ شہری ریاستیں ہو، یا قبائل ہو، یا آج کل کے دور کی بڑی بڑی ریاستیں ہوں، ان سب کے درمیان تعلقات کو اس اصول کی بناپر قائم کیا جائے گا۔ کہ دوستانہ بین الاقوامی اور بین الملکی تعلقات کے نقطہ نظر سے غیر مسلموں کو تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

- مخالفین
- غیر مخالفین

مخالفین سے مراد وہ غیر مسلم ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو اللہ کے راستے پر چلنے سے روکا ہو، انہوں نے مسلمانوں کو ان کے گھر بار سے نکالا ہو، مسلمانوں سے جنگ کی ہوں، ان کے جان و مال کو تباہ کیا ہو ان کی عزتیں کوٹی ہوں تو ظاہر ہے اب ایسے لوگوں سے دوستی اور رواداری کو حکم نہیں دیا جاسکتا، اور نہ ہی ان سے کسی قسم کا کوئی معاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

دوسرا گروہ غیر مخالفین کا ہے۔ غیر مخالفین سے مراد وہ مسلموں کا وہ گروہ ہے۔ جنہوں نے مسلمانوں کو گھروں سے نہیں نکالا مسلمانوں کو پریشان نہیں کیا اور نہ ہی ان کو ان کے دین کے مسئلے میں کسی قسم کی کوئی اذیت دی ہو۔

غیر مسلموں کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جو دار الحرب کے کسی علاقے میں بطور حاکم فائز تھے۔ قرآن پاک نے سارے غیر مسلموں کو ایک ہی صف میں نہیں رکھا، بلکہ قرآن مجید میں مختلف غیر مسلموں کے مختلف احکام بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً: قرآن پاک نے عیسائیوں کو مسلمانوں کے زیادہ قریب قرار دیا اور مشرکین کو سب سے زیادہ دور۔ پھر عرب کے مشرکین کو عام مشرکین کے مقابلے میں اسلام نے زیادہ دور قرار دیا اور ان کے بارے میں کسی سے رعایت سے کام نہیں لیا۔[1]

قرآن پاک کے اس اسلوب کے مطابق بنیادی طور پر غیر مسلموں کی دو قسمیں قرار دی گئیں پہلی قسم ان غیر مسلموں کی تھی۔ جو اصلاً آسمانی پیروی کے مدعی تھے۔ یہ اہلِ کتاب تھے جو اس اعتبار سے مسلمانوں کے قریب اور

[1] عمری، مولانا سید جلال الدین، **غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق**، (نئی دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، 2007،) ص 60۔

مسلمانوں کے مشابہ تھے کہ وہ اپنی اپنی جگہ ان بنیادی تصورات اور عقائد کو کسی نہ کسی رنگ میں تسلیم کرتے تھے۔ مثلاً: توحید، نبوت، آخرت کو مانتے تھے۔ وہ ان انبیا کرام میں سے بیشتر کو مانتے تھے۔ جن کو قرآن نے بطور نبی تسلیم کیا ہے اور جن کے نام قرآن میں آئے ہیں۔ اس لیے غیر مسلموں کی اقسام میں سب سے پہلے انہیں رکھا گیا۔

اہلِ کتاب کے بعد دوسرا درجہ ان غیر مسلموں کا رکھا گیا ہے۔ جن کو فقہاء نے شبہ اہلِ کتاب قرار دیا ہے، یعنی وہ مسلم جو بعض اعتبارات سے اہلِ کتاب کے مشابہ تھے۔ ایسے غیر مسلموں سے مسلمانوں کا واسطہ رسول ﷺ ہی کے وقت میں پڑا تھا۔[1]

غیر مسلموں سے تعلقات کی حدود

اسلام خیر خواہی کی تعلیم دیتا ہے اور امن و سلامتی، رواداری اور عفو و درگزر کا درس دیتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی امت آخری ہے اور آپ ﷺ آخری نبی ہیں۔ آپ ﷺ کی امت کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں:

ایک امت اجابت یعنی جس نے آپ ﷺ کو نبی اور اسلام کی تعلیمات کو مان لیا ہے۔

دوسری امت دعوت یعنی جس نے آپ ﷺ کو نبی مانے اور اسلام کی تعلیمات کو مانے سے انکار کیا۔

امت اجابت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ امت دعوت تک اسلامی تعلیمات کو احن طریقے سے پہنچائے۔ لہذا ایک مسلم کے لیے یہ روا نہیں سمجھا جاتا کہ وہ تنہائی پسند ہو یا گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے لگے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ غیر مسلم سے عام انسانی اور خلاقی روابط مضبوط کر کے ان کو دعوت اسلام پیش کرتا رہے۔ البتہ یہ کام کچھ حدود اور حکمت کے ساتھ سرانجام دینا ہوگا۔[2]

غیر مسلم بردرانِ وطن کے ساتھ تعلقات کی حدود کے بارے میں فقہانے بھی کچھ یوں معاملات کرنے کی اجازت دی ہے۔ بہت سی جگہوں میں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ موالات اور دوستی اور محبت سے شدت کے ساتھ روکا گیا ہے۔ ان تصریحات کو دیکھ کر حقیقت حال سے ناواقف غیر مسلموں کو یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے مذہب میں غیر مسلموں سے کسی قسم کی رواداری اور تعلق کی، بلکہ حسن اخلاق کی بھی کوئی گنجائش نہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ کے اسوہ حسنہ سے ہمیں رواداری کی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔

---

[1] عمری، **غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق**، ص 61۔

[2] محمد عامر، ''**ادیان ثلاثہ اور مذہبی رواداری: تحقیقی و تقابلی جائزہ**''، (مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی، معارف اسلامیہ، کراچی، 2004)، ص 106۔

دو شخصوں یا دو جماعتوں میں تعلقات کے مختلف درجات ہوتے ہیں۔

پہلا درجہ تعلق کا قلبی موالات یا دلی محبت ہے، یہ صرف مومنین کے لیے مخصوص ہے۔ غیر مومن کے ساتھ مومن کا یہ تعلق کسی حال میں قطعاً جائز نہیں ہے۔

دوسرا درجہ مواسات کا ہے، جس کے معنی ہیں۔ ہمدردی و خیر خواہی اور نفع رسانی کے، یہ سوائے کفار اہلِ حرب کے کو مسلمانوں سے برسرپیکار ہیں۔ باقی سب غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے۔

تیسرا درجہ مدرات کا ہے، جس کے معنی ہیں ظاہری خوش خلقی اور دوستانہ برتاؤ کے، یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے۔ جب کہ اس سے مقصود ان کو دینی نفع پہنچنا ہو یا وہ اپنے مہمان یا ان کے شر اور ضرر رسانی سے اپنے آپ کو بچانا مقصود ہو۔ یعنی کافروں سے موالات سے جائز نہیں، مگر ایسی حالت میں جب کہ تم ان سے اپنا بچاؤ کرنا چاہو اور چوں کہ مدرات میں بھی صورت موالات کی ہوتی ہے اس لیے اسکو موالات سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

چوتھا درجہ معاملات کا ہے کہ ان سے تجارت یا اجرت و ملازمت اور صنعت و حرفت کے معاملات کیے جائیں۔ یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے۔ سوائے ایسی حالت کہ کے ان معاملات سے عام مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہو۔ فقہاء کرام نے اسی بناء پر کفار اہلِ حرب کے ساتھ اسلحہ فروخت کرنے کو ممنوع قرار دیا، باقی تجارت وغیرہ کی اجازت دی اور ان کو اپنا ملازم رکھنا یا خود ان کے کارخانوں اور اداروں میں ملازم ہونا یہ سب جائز ہے۔[1]

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قلبی اور دلی دوستی و محبت کی تو کسی کافر کے ساتھ کسی حال میں گنجائش نہیں اور احسان و ہمدردی و نفع رسانی سوائے اہلِ حرب کے اور سب کے ساتھ جائز ہے۔ اسی طرح ظاہری خوش خلقی اور دوستانہ برتاؤ بھی سب کت ساتھ جائز ہے۔ جب کہ ان کا مقصد مہمان کی خاطر داری یا غیر مسلموں کو اسلامی معلومات اور دینی نفع پہنچانا یا اپنے آپ کو ان کے کسی نقصان و ضرر سے بچانا ہو۔

اسلام دیگر مذاہب سے ہم آہنگی، روابط اور تعلقات کے حوالے سے بلاشبہ کچھ تحفظات بھی رکھتا ہے۔ وہ انسانیت کی بناپر ہر طرح کے تعلقات استوار کرنے کا روادار ہے۔ تاہم دین و مذہب اور تشخص کے حوالے سے بہت محتاط اور متوازن رویہ رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے وہ نہ تو ایسے افراد سے مکمل مقاطعہ کر لیں۔ کیونکہ اس سے مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے درمیان ایک ذہنی خلیج حائل ہو جائے گی۔ دونوں کے درمیان

---

[1] قاسمی، شوکت علی، **اسلامی رواداری**، (دیوبندی: اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند، س ن)، ص 70۔

نفرت اور مخالفت کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں، اور نہ ہی اس رواداری میں اس قدر آگے بڑھیں کہ سب کچھ ہی ان کے حوالے کر دیا جائے۔

لہذا غیر مسلموں سے تعلقات درج ذیل حدود و شرائط پر مبنی ہونے چاہئیں:

فتنہ پرواز اور برسرپیکار غیر مسلموں کو رازدار و دوست بنانے کی ممانعت

اسلام دیگر مذاہب کے ایسے فراد کو جو فتنہ برپا کرنا چاہتے ہوں یا غداری کے مرتکب ہوں یا مسلمانوں سے برسرپیکار ہوں انہیں اپنا رازدار، دوست بنانے کی ممانعت کرتا ہے۔

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیَاتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾[1]

''اے لوگوں جو ایمان لائے ہو اپنے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ وہ تمہاری خرابی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے وہ چاہتے ہیں کی تم کو تکلیف پہنچے ان کی دشمنی ان کی باتوں سے ظاہر ہے اور جو کچھ ان کے دل چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے بڑھ کر ہے اگر تم سوجھ بوجھ رکھتے ہو۔ ہم نے تمہارے لیے نشانیاں کھول کر ظاہر کر دی ہیں تاکہ تم احتیاط کرو''

اسلام مداھنت کا قائل نہیں

اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم روشن خیالی اور آزاد خیالی میں اس قدر کھو جائیں کہ اپنے ملی تشخص اور دینی شعار ہی پر سمجھوتہ کر لیں۔ آپ ﷺ کی تیرہ سالہ مکی زندگی سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے کہ آپ نے ہر قسم کا تشدد اور ظلم برداشت کر لیا لیکن مداھنت اور سودے بازی کا راستہ اختیار کیا۔[2]

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَیُدْهِنُوْنَ﴾[3]

ترجمہ: وہ تو اس آرزو میں ہیں کہ کسی طرح نرمی کرو تو وہ بھی نرم پڑ جائیں۔

---

[1] آلِ عمران: 118

[2] محمد اسلم، **''قرونِ اول میں مسلمانوں کے غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات''** (لاہور: مقالہ برائے پی۔ ایچ ڈی پنجاب یونیورسٹی 2002)، ص 28۔

[3] القلم: 9۔

کفار مکہ نے آپ ﷺ سے یہ سمجھوتا بھی کرنا چاہا کہ نہ آپ ﷺ ان کے معبودوں کو برا بھلا کہیں اور نہ وہ آپ ﷺ کے مذہب کو باطل قرار دیں گے۔ آپ ﷺ نے صاف صاف بتادیا کہ اسلام اور کفر کی راہیں جدا جدا ہیں ۔لہذا ان دونوں میں سے کسی بات پر مصالحت ناممکن ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾[1]

ترجمہ: "تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین"

محاربین اور غیر محاربین میں فرق

قرآن مجید نے غیر مسلموں سے تعلقات کے حوالے سے واضح کر دیا ہے کہ غیر مسلموں سے ہم آہنگی اور رواداری کی حدود، ضابطے اور اصولی قاعدے کیا ہیں۔ جو لوگ اسلام کے نظام فکر و عمل سے اختلاف رکھتے ہیں۔ وہ دو طرح کے رویے اختیار کر سکتے ہیں۔ ایک رویہ عدوت اور مخاصمت کا ہو گا کہ وہ مسلمانوں کو آزادی اور امن و سکون سے رہنے نہ دیں اور اسلامی ریاست سے ان کی جنگ جاری ہو۔ دوسرا رویہ آزادی، حریت فکر و عمل اور ظلم و زیادتی سے اجتناب کا ہو گا۔ اسلام نے ان دونوں رویوں کے درمیان فرق کیا ہے۔ وہ پہلے گروہ سے تمام انسانی ہمدردی اور تعاون سے منع نہیں کرتا البتہ موالات اور رازدارانہ تعلقات سے منع کرتا ہے۔ کیونکہ یہ چیز دشمن کو تقویت پہنچانے کے ہم معنی ہے۔ جہاں تک دوسرے گروہ کا تعلق ہے ،اس کے ساتھ حسن سلوک ،تعاون اور ہمدردی کی اجازت دیتا ہے،اس سے منع نہیں کرتا۔[2]

کافروں کے شر سے بچاؤ کے لیے دوستی جائز ہے

قرآن مجید میں مومنوں کے لیے کافروں سے دوستی کا ایک استثناء بتایا گیا ہے کہ ان کافروں سے بچاؤ کی تدبیر کے طور پر دوستی کا سا عمل کیا جائے تو کوئی برائی نہیں ہے۔

---

[1] الکافرون:6۔

[2] اسلم، **قرونِ اول میں مسلمانوں کے غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات**، ص28۔

﴿لَّا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكَافِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقَاةً وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَه وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ﴾[1]

ترجمہ: ''مومنوں کو چاہیے کہ وہ ایمان والوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں جو ایسا کریے گا وہ اللہ کی کسی حمایت میں نہیں مگر یہ کہ ان کے شر سے کسی طرح بچاؤ مقصود ہو''۔

اس آیت سے تقیہ کا ثبوت ملتا ہے۔ جس کے معنی ہیں 'دین کا خوف اور دنیوی مال و متاع اور امارت کا خوف'

دنیوی معاملات میں موالات کی اجازت

مومنوں اور کافروں کے درمیان محبت اور موالات صرف امور دین اور مملکت کے اہم کاموں میں ممنوع ہے، دینوی مصالح جن کا ضرورت تقاضا کرتی ہے اس کی ممانعت نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ جب ہجرت فرما رہے تھے۔ تو ان کے ساتھ ایک رہبر عبداللہ بن اریقط[2] تھا مگر نبی کریم ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ اس سے مطمئن تھے۔[3]

دین اسلام کی اہانت نہ ہو

غیر مسلموں سے ایسا معاہدہ جو اسلام کے عظمت اور شرف میں کمی کا باعث ہو جائز نہیں ہے۔ یعنی کفار کے ساتھ ایسی دوستی درست نہیں ہے۔ جس سے ہمارے دین کی رسوائی ہو یا ہمارے دینی بھائیوں کو تکلیف ہو۔ اسلام ایسے اتحاد کو پسند نہیں کرتا کہ جس میں شاطرانہ سیاست کاری سے مسلمانوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کی دولت کو ہڑپ کیا جائے۔[4]

---

[1] آلِ عمران: 28۔

[2] عبداللہ بن اریقط کا قبیلہ بنی بکر وائل تھا انہیں سیدنا صدیق اکبر نے کرایہ پر لیا تھا اور انہیں کہا تھا کہ وہ عامر بن فہیرہ، غلام صدیق اکبر کے ساتھ غار تک پہنچ جائیں۔ وہ راستہ جانتے تھے اس لئے جناب صدیق اکبر نے انہیں کرایہ پر لیا تھا۔ مزید تفصیلات کے لیے؛ https://defenseofsahaba.wordpress.com/2013/06/17

[3] اسلم، **قرونِ اول میں مسلمانوں کے غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات**، ص28۔

[4] ایضا، ص30۔

مذہبی تعلقات کی حدود:

اسلام مذہب میں جبر کا قائل نہیں ہے۔اور نہ اس چیز کو پسند کرتا ہے۔اسلام چونکہ اللہ کے ہاں واحد قابلِ قبول دین ہے۔اس لیے ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ ہم کسی دوسرے کو اس کے مذہب کے بارے میں کوئی تنقید کرے یا اس کو اس مسئلے میں کسی قسم کی کوئی زبردستی کرے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ [1]

ترجمہ:''دین کے معاملے میں زبردستی نہیں ہے، بے شک ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے''

اس لیے یہ نہ ماننے والوں کو حکمت کے ساتھ اپنے اندر شامل ہونے کی دعوت دیتا ہے۔اہلِ کتاب چونکہ ''اقرب الی الاسلام''ہیں اس لیے ان کے انکار پر قرآن نے انہیں مشترکہ اقدار کی طرف دعوت دی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾[2]

ترجمہ:''کہہ اے اہلِ کتاب! ایک بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے کہ سوائے اللہ کے اور کسی کی بندگی نہ کریں اور اس کا کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور سوائے اللہ کے کوئی کسی کو رب نہ بنائے، پس اگر وہ پھر جائیں تو کہہ دو گواہ رہو کہ ہم تو فرمانبردار ہونے والے ہیں''

مجموعی طور پر اسلام دیگر مذاہب کے ساتھ پرامن بقائے باہمی کا علمبردار ہے۔اسلام نے مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ معاشرتی مذہبی و معاشی تعلقات کن حدود و قیود کے ساتھ قائم رکھنے کی اجازت دی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ میل ملاپ رکھا جائے تاکہ ان تک اسلام کا صحیح پیغام پہنچانے کی راہ ہموار ہو جائے۔لیکن اس میں

---

[1] البقرہ:256۔

[2] آلِ عمران:64۔

ایک بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ اسلام کی کسی واضح تعلیم کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے اور فتنہ کرنے والے لوگ اس سے غلط فائدہ نہ اُٹھا کر اسلام کو اپنے مذہب میں ضم کرنے کی مذموم کوشش نہ کر سکیں۔[1]

غیر مسلموں کے ساتھ سماجی تعلقات

سماج یا انسانی معاشرے میں رہنا انسان کی ایک طبعی اور ناگزیر تمدنی ضرورت ہے۔اسی طرح اہلِ سماج سے سماجی و تمدنی تعلقات قائم کرنا بھی انسان کی ایک فطری ضرورت ہے جس کے سوا اس کے لیے چارہ کار نہیں۔اس لیے اہلِ ذمہ کو اس بات کا حق اور اجازت دی ہے کہ وہ معاشرے میں اپنے ہم خیال لوگوں کے علاوہ مسلمانوں سے بھی سماجی مراسم و تعلقات قائم کر سکتے ہیں۔اسی طرح اسلام اور پیغمبرِ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو بھی اس بات کی تعلیم دی ہے کہ وہ غیر مسلم اہلِ ذمہ سے سماجی و تمدنی تعلقات بنا کر حسنِ اخلاق کا مظاہرہ کریں اور اپنے خلاق سے ان کے دلوں کو فتح کرنے کی کوشش کریں۔اسلام میں والدین اور عزیز و اقارب کے ساتھ مسلمان معاشرہ میں مقیم یتیموں، مسکینوں، بیواؤں، مسافروں اور ہر قسم کے محتاج و ضرورت مند لوگوں کے ساتھ ہمدردی خیر خواہی اور حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے اور ان کے ساتھ غیر اخلاقی برتاؤ کرنے کی مذمت کی گی ہے اور اسے ایک مسلمان کی شان کے منافی بتایا گیا ہے۔اہل علم سے مخفی نہیں کہ قرآن و حدیث کی ان نصوص کا حکم عام ہے۔

مسلم و غیر مسلم کے ساتھ بھی غیر اخلاقی رویہ اختیار کیا جائے گا وہ غیر اسلامی رویہ ہو گا۔ نبی کریم ﷺ نے تو جانوروں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے اور کتے جیسے جانور کے ساتھ ہمدردی پر مغفرت اور اجر کی نوید سنائی ہے۔جس انسان کے ساتھ بھی مسلم و غیر مسلم کی تمیز و تفریق کے غیر اخلاقی رویہ برتا جائے گا وہ اسلامی اخلاق کے منافی ہو گا۔

غیر مسلم کی دعوت قبول کرنا

نبی کریم ﷺ نے غیر مسلموں کے ہدیہ اور دعوت کو بھی قبول کیا،اور اگر کوئی غیر مسلم ہمسایہ ہوتا اور اس کو مدد کی ضرورت ہوتی تو نبی کریم ﷺ اس کی مدد بھی فرماتے۔[2]

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

---

[1] عمری، **غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق**، ص72۔

[2] ایضاً: ص75۔

﴿اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ﴾ [1]

ترجمہ: آج تمہارے واسطے سب پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں، اور اہل کتاب کا کھانا تمہیں حلال ہے اور تمہارا کھانا انہیں حلال ہے۔

غیر مسلم کی عیادت

سماجی تعلقات، روایات، اخلاقیات اور تقاضوں میں ایک اہم تقاضہ یہ بھی ہے۔ کہ ارد گرد اور متعلقین میں کوئی آدمی بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت اور خبر گیری کی جائے۔ اسلام نے مریض کی عیادت کی ترغیب دی ہے، اور اسے بہت بڑا کارِ ثواب قرار دیا ہے۔ ان تعلیمات میں مسلم و غیر مسلم کی کوئی تقسیم نہیں۔

غیر مسلموں کے ساتھ لین دین

سماجی تعلقات و مراسم کا ایک اہم اور سر فہرست تقاضا باہمی لین دین، خرید و فروخت کاروباری تعلقات اور معاملات بھی ہے۔ جو چیزیں شریعت کی نگاہ میں حرام ہیں۔ مثلاً: شراب اور خزیر وغیرہ ان کی خرید و فروخت اور لین دین کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے، انکی لین دین جائز ہے۔

غیر مسلموں سے معاملات

غیر مسلموں سے تجارت یا اجرت و ملازمت اور صنعت و حرفت کے معاملات کیے جائیں، یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے۔ بجز ایسی حالت کے کہ ان معاملات سے عام مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہو۔ نبی کریم ﷺ اور خلفاء راشدینؓ صحابہؓ نے اس بنا پر اہلِ حرب کے ساتھ اسلحہ فروخت کرنے کو ممنوع قرار دیا، باقی تجارت وغیرہ کی اجازت دی وران کو ملازم رکھنا یا خود ان کے کارخانوں اور اداروں میں ملازم ہونا یہ سب جائز ہے۔[2]

---

[1] المائدہ: 5۔

[2] عمری، **غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق**، ص78۔

غیر مسلموں سے باہمی تعلقات کے اصول

اسلام، مسلمانوں کو باہم اعلیٰ اخلاقی رویہ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔انھیں ایک دوسرے کا بھائی قرار دیتا ہے،ان کے باہم اخلاقی اور قانونی حقوق مقرر کرتا ہے،ان کے درمیان تعاون و تناصر کا جذبہ بیدار کرتا ہے۔اور انھیں ایک نظام حیات دے کر ایک امت بناتا ہے۔اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی فراموش نہیں ہونی چاہیے کہ اسلام نے اس امت کو ایک اعلیٰ نصب العین دیا ہے،وہ یہ کہ وہ دنیا میں خدائے واحد کے دین کے علم بردار بن کر اُٹھے،انسانوں کو ان کی دنیا اور آخرت کی فلاح وہدایت کا پیغام دے،دنیا میں خیر کو عام کرے،بھلائیوں کو پھیلائے اور برائیوں کو مٹائے۔

قرآن وسنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں سے تعلقات اور بقائے باہمی کی اساس وبنیاد درج ذیل اصول ہیں۔

1. شرف انسانیت وعظمت

عظمت آدمیت اور تکریم انسانیت اسلام کی تعلیمات کی اہم جز ہیں۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدم﴾ [1]

ترجمہ:"اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی ہے"

اسلام بلا تفریق رنگ ونسل،علاقہ وزبان مذہب وملت تمام انسانوں کو شرف انسانیت کے بلند مقام پر فائز کرتا ہے۔اور بحیثیت انسان اس کی قدر ومنزلت اور اس کے حقوق کا لحاظ رکھتا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا﴾ [2]

ترجمہ:"اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کی زندگی بخشی"

قرآن مجید میں جہاں بھی نیکی،عفوودرگزر اور رحمدلی کا حکم دیا گیا ہے۔وہاں یہ نہیں بیان کیا کہ غیر مسلم کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کیا جائے گا۔بلکہ یہ لفظ بولا گیا ہے کہ "انسان" کو بچانا اور انسانوں کے ساتھ بھلائی وغیرہ اس طرح کے

---

[1] الاسرا:70۔

[2] المائدہ:32۔

الفاظ بولے گے ہیں۔اسلام دیگر مذاہب اور اقوام کے ساتھ باہمی تعلقات کی اساس میں انسانی قدروں اور حرمت انسانیت کوایک بنیادی جزقرار دیاہے۔[1]

2. عدل

مسلمانوں کو تمام معاملات میں دیانت داری اور انصاف کا حکم دیا گیاہے،خواہ معاملہ اپنے دشمنوں کا ہی کیوں نہ ہو۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾[2]

ترجمہ:"اے ایمان والو! اللہ کے واسطے انصاف کی گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جاؤ،اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہر گز نہ چھوڑو،انصاف کرو کہ یہی بات تقویٰ کے زیادہ نزدیک ہے،اور اللہ سے ڈرتے رہو،بے شک اللہ اس سے خبر دار ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔"

لہذا عدل وانصاف کا تصور اسلام کا ایک اساسی اصول ہے۔لہذا اسلام عدل ودیانتداری کے تعلق سے غیر مسلموں سے بقائے باہمی میں جاری رکھنا چاہتا ہے۔چاہے اس کا تعلق افراد،کسی گروہ یا ریاستوں سے ہی کیوں نہ ہو۔

3. امن،امداد باہمی اور تعاون

امن وسلامتی اور باہمی تعاون وہمدردی بھی ایک اہم اصول ہے جو باہمی تعلقات کے استحکام اور پائیداری میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ﴾ [3]

---

[1] محمد سجاد، "غیر مسلموں سے تعلقات اور بقائے باہمی کی اساس، سیرت النبی ﷺ کے تناظر میں"، العلم، جلد 2، شمارہ 2، (2018)، ص 173۔

[2] المائدہ: 8۔

[3] المائدہ: 2۔

ترجمہ: "اور آپس میں نیک کام اور پرہیز گاری پر مدد کرو، اور گناہ اور ظلم پر مدد نہ کرو، اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے"

اس آیت سے صاف صاف پتہ چلتا ہے کہ معاشرتی سطح پر انسانوں کی فلاح و بہبود کے تمام اقدامات "بِر" میں شامل ہیں انسانوں کی زندگی کو بنانے اور سنوارنے کے سارے اعمال اور انسانوں کی عمومی خدمت انجام دینا یہ سب باتیں "بِر" میں شامل ہیں۔

4. عہد کی پاسداری و تکمیل

باہمی تعلق میں ایک اور اہم اساسی اصول عہد کی پاسداری اور تکمیل ہے۔اسلام مسلمانوں پر یہ اخلاقی فریضہ عائد کرتا ہے کہ وہ انفرادی حیثیت میں بھی اور اجتماعی سطح پر بھی تمام شخصی، قولی اور بین الاقومی معاہدوں کی ہاسداری کریں۔قرآن پاک کی متعدد آیات میں مسلمانوں کو اپنے عہد وقرار کی پاسداری کی تلقین کی گئی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا﴾[1]

ترجمہ: ''اور عہد کی پاسداری کرو بے شک عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا''

اسلامی ریاست میں تمام افراد کو مذہبی اور گروہی تعصبات سے آزاد جمہوری حقوق و فرائض کے مابین دو طرفہ تعلق کی بنیاد پر شہری حقوق حاصل ہوتے ہیں۔مذہب اور نظریات کی آزادی، جس کے ساتھ عمل اور اظہار کے پرامن اور شائستہ وسائل موجود ہوں،اسلام ہمیں اس طرح کی تعلیم دیتا ہے۔

5. عدم اکراہ اور حریت فکر

دین اسلام،امن و سلامتی کا دین ہے اس میں جبر و تشدد نہیں۔یہ اپنی بات افہام و تفہیم،دلیل،وعظ و نصیحت اور بحث و گفتگو کے ذریعہ دوسروں تک پہنچانے کا حکم دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجبور نہیں کیا، بلکہ اختیار اور آزادی سے نوازا ہے۔اپنے رسولوں کے ذریعے حق و باطل کو واضح کیا اور انسان کو پوری دی ہے کہ ان سے جو راہ چاہیے اختیار کرے،اسلامی ریاست کسی ذمی یا مستامن کو اسلام

[1] الاسرا:34۔

قبول کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ اگر کسی کو مجبور کیا گیا اور اس نے مجبوری کی حالت میں اسلامی کا اظہار کیا تو اس کا اعتبار نہیں ہو گا۔

عدم اکراہ کے ساتھ ساتھ دین اسلام دیگر مذہب کے مکمل احترام کی تعلیمات دیتا ہے۔ اسلام نے شرک کی مذمت کی ہے۔ اس بنیاد پر مشرکین کے معبودوں کو، جنہیں معبود باطل سمجھتا ہے ان کو گالی دینے سے منع کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾[1]

ترجمہ: "اور جن کی یہ اللہ کے سوا پرستش کرتے ہیں انہیں برا نہ کہو ورنہ وہ بے سمجھی میں زیادتی کر کے اللہ کو برا کہیں گے"

دوسری طرف تعلیم دی گئی ہے کہ احسن طریق سے ان سے برتاؤ کیا جائے، تہذیب شائستگی اور حسن خلق سے ان کے دل جیتنے کی کوشش کی جائے۔ اور غیر مسلموں کو دعوت دینے کا بھی طریقہ اسلام نے بہت واضح کر دیا ہے۔ کہ ان کے ساتھ بہترین طریقے سے وعظ کو اور تاکہ تمہارا طریقہ ان کو تمہارے دین کی طرف لے آئے۔

6. معاہدہ امن و تعاون

ہجرت کے بعد مدینہ پہنچنے پر نبی کریم ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے مختلف قبائل کو ایک معاہدے کا پابند بنایا، اسی کے ساتھ آپ ﷺ نے یہود سے بھی معاہدہ فرمایا۔ الغرض پر امن بقائے کے باہمی اور مشترکہ اصولوں پر اتفاق کرنے کی دعوت دی۔ اس نے اہلِ کتاب کو ایک مشترکہ کلمہ پر جمع ہونے کی دعوت دی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے ہم عصر قریبی کتابی حکمرانوں اور اقوام سے پر امن بقائے باہمی کی ہر ممکن کوشش فرمائی۔ حبشہ سے ہونے والا معاہدہ صدیوں سے قائم رہا گویا بین الاقوامی سطح پر پر امن بقائے باہمی اور دوستانہ روابط کا حبشہ ماڈل کامیاب ترین ماڈل تھا۔

[1] الانعام: 108۔

اسلام شرفِ انسانیت کا علمبر دار دین ہے۔ ہر فرد سے حسنِ سلوک کی تعلیم دینے والے دین میں کوئی ایسا اصول یا ضابطہ بیان نہیں کیا گیا، جو شرف انسانیت کے منافی ہو۔ دیگر طبقات معاشرہ کی طرح اسلامی ریاست میں اقلیتوں کو بھی ان تمام حقوق کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔[1]

اسلام ہمیں ہر ایک مذہب سے تعلق رکھنے والے سے زندگی کے کسی معاملے میں کٹ کر رہنے کا حکم نہیں دیتا بلکہ یہ حکم دیتا ہے کہ ایک حد میں رہتے ہوئے اور ان اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے غیر مسلموں سے ہر ایک معاملہ طے کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اسی طرح وہ ہمارے دین کے اور ہمارے قریب آ سکتے ہیں۔ اور اسلام کی تعلیمات سے آگاہی حاصل کر کے اسلام سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہو سکتے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات رکھنے کی ایک حد متعین کر دی ہے جس کے مطابق ہم اُن کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ نبی ﷺ نے اپنی ہر بات کو عملی جامہ پہنایا تاکہ ہمارے لیے اس پر عمل پیرا ہونا آسان ہو سکے۔ اگر ہم اُن حدود میں رہ کر زندگی بسر کریں گئے۔ تو ہمارا معاشرہ امن و سلامتی، محبت اور رواداری کا گہوارا بن جائے گا۔

[1] سجاد، **غیر مسلموں سے تعلقات اور بقائے باہمی کی اساس، سیرت النبی ﷺ کے تناظر میں**، ص182۔

باب سوم

بابا فرید اور مولانا روم کے افکار کا تجزیاتی مطالعہ

فصل اول: بابا فریدؒ کی تعلیماتِ امن و رواداری

فصل دوم: مولانا رومؒ کی تعلیماتِ امن و رواداری

فصل سوم: بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کی تعلیماتِ امن و رواداری کے اثرات

بابا فرید اور مولانا روم کے افکار کا تجزیاتی مطالعہ

اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے اور اسی طرح دنیا والوں تک اسلام کا پیغام پہنچانے والے حضرت محمد ﷺ دونوں جہانوں کے لیے رحمت ہیں۔ یہی وہ امن و سلامتی کا پیغام ہے، جسے صوفیا کرام نے بڑی شد و مد سے دنیا والوں تک پہنچایا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ صوفیا نے انسانی برابری، آپس میں بھائی چارے اور بلا امتیاز مذہب و ملت، انسانیت کی بے شمار خدمت کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اور کیا ہے، وہ سب ان صوفیا کا اپنا خیال اور فکر ہے لیکن ایسا نہیں ہے یہ ایک بے بنیاد خیال ہے۔ سچ تو ہے کہ ہمارے صوفیا نے دین و دنیا میں جو بھی مقام حاصل کیا ہے جس کی وجہ سے مختلف مذاہب کے ماننے والے ان کا احترام کرتے ہیں، ان سے محبت کرتے ہیں، وہ دراصل اسلام ہی کی دین ہے۔ بابا فریدؒ کی تعلیمات میں سب سے نمایاں پہلو لوگوں میں محبت بانٹنا، صبر و تحمل اور امن و رواداری کا عنصر ہے۔ بابا فریدؒ کے تمام اشلوکوں میں اعتدل پسندی، رواداری اور انسان دوستی کا پیغام دیا ہے۔ تعصب، تنگ نظری اور گروہ پرستی جیسے عناصر کو ناپسند کیا ہے۔ جس طرح ہمارے نبی کریم ﷺ نے غیر مسلموں کے ساتھ محبت و رواداری کا مظاہرہ کر کے ان کو اپنے قریب لایا پھر اُن کو اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کیا اور دائرہ اسلام میں داخل کیا، بابا فریدؒ نے بھی نبی کریم ﷺ کے اسوہ حسنہ کو اپنا کر اُس وقت کے غیر مسلموں کو اسلام کے دائرہ میں داخل کیا۔ انہوں نے اپنی شاعری سے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنائی، یہی وجہ ہے کہ آج تک لوگ ان کی شاعری کو پڑھتے ہیں اور اور اس سے مستفید ہوتے ہیں۔

مولانا کی نصائح کے لیے مثنوی کو دیکھ لینا کافی ہے۔ آپ اپنے مرید و معتقد اور ہم صحبت لوگوں کے لیے بھی ہمیشہ آپکا کلام اسی قسم کا ہوتا تھا۔ فرماتے تھے کہ جب پرندہ آسمان کی طرف اُڑتا ہے تو آسمان پر نہیں پہنچتا مگر ہاں شکاریوں کے جال میں گرفتار ہونے سے بچ جاتا ہے۔ اسی طرح جو شخص سلسلہ فُقر میں داخل ہو کر تقرب الی اللہ کی کوشش کرے وہ اگر فقیری کے کمال کو نہ بھی پہنچے تو پھر بھی عام دنیاوی اور بازاری خلقت سے الگ شمار کیا جاتا ہے، اور بہت سی دنیاوی زحمتوں سے نجات پا کر کچھ نہ کچھ حاصل کر ہی لیتا ہے۔

مولانا کے دوستوں میں سے ایک صاحب اپنے حالات اور بعض دوسری پریشانیوں کی وجہ سے پریشان تھے تو مولانا نے اُن کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ ساری مشکلات اس دنیا سے دل لگانے کی وجہ سے ہیں۔ اگر آپ اس دنیا کو عارضی چیز سمجھے اور اپنے آپ کو مسافر سمجھے تو حالات کی سردی اور گرمی کو آرام سے سہہ جائے گئے۔ اور یہ خیال کریں

کہ یہ حالت عارضی ہے اور ختم ہو جائے گی، اور ہر حالت میں یہ ہی تصور کریں تو آپ کو کبھی پریشانی نہیں ہو گی۔ جہاں مولانا رومؒ کے مزاج میں قناعت، فیاضی اور ایثار جیسے جذبے نمایاں ہیں۔ اُدھر ہی عفوودر گزر، محبت، پیار، صبر اور برداشت جیسی تعلیمات بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ نہ صرف مشرق بلکہ مغرب میں مولانا کی تعلیمات کو پڑھا جاتا ہے، اور لوگ ان سے مستفید ہوتے ہیں۔ مولانا رومؒ ہر شخص خواہ وہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ، عام ہو یا خاص یکساں سلوک کرتے تھے، اور کسی قسم کا فرق نہیں رکھتے تھے۔ میری یہ عادت ہے کہ میری وجہ سے کبھی کسی کو تکلیف نہ ہو، اور کسی کا دل نہ دکھے۔ اگر سماع کے دوران مجھے کوئی چوٹ پہنچادے، تو میں اپنے ساتھیوں سے کہتا ہوں کہ اُس کو کچھ نہ کہو بلکہ اس سے در گزر کا معاملہ کرو۔ میں اس سے خوش ہوں۔ ایک دفعہ آپ کی اہلیہ اپنی لونڈی کو سزا دے رہی تھی، تو آپ سخت ناراض ہوئے اور کہا کہ اگر اس کی جگہ تم ہوتی تو تمہاری کیا حالت ہوتی۔[1]

اسی طرح دوسروں کو برداشت کرنے کے ضمن میں مولانا کی ایک مثال بہترین ہے۔ ایک دفعہ دو لوگ آپس میں جھگڑ رہے تھے، اور ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہوے کہہ رہے تھے کہ اگر ایک کہے گا تو سو سنے گا۔ مولانا ادھر سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے اس شخص سے کہا جو کہنا ہے مجھ سے کہو مجھے ہزار کہو گے تو ایک بھی نہ سنو گئے۔ یہ بات سن کر وہ دونوں شرمندہ ہو گئے اور صلح کر لی۔[2]

ایسی حالت میں عالمِ اسلام کو ایک ایسی بلند اور طاقت ور شخصیت کی ضرورت تھی۔ جو اپنی گرمی عشق اور محبت بھرے پیغام سے عالم اسلام میں ایک نئی روح پھونک دے۔ جو اپنی تعلیماتِ امن و رواداری اور پیغامِ محبت سے معاشرے کے لوگوں کو پھر سے یکجا کر دے اور ان کو ایک اللہ کے دین پر عمل پیرا ہونے اور ایک راستے اختیار کرنے میں معاون ثابت ہو۔ اور یہ شخصیت مولانا جلال الدین رومیؒ کی تھی۔ جنہوں نے آکر اپنی تعلیمات کے ذریعے معاشرے میں امن و سکون اور محبت و رواداری کی فضا قائم کیں۔

---

[1] شبلی نعمانی، **سوانح مولانا روم**، ص53۔

[2] ایضا، ص54-53۔

فصل اول: بابا فریدؒ کی تعلیماتِ امن ورواداری

حضرت بابا فریدؒ کو چشتی سلسلہِ تصوف میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔آپ کی پوری زندگی عبادت، ریاضت اور فقیری کی جن منزلوں سے گزری،اس کی کوئی مثال نہیں۔ بابا فریدؒ جیسے عظیم صوفیا کی تعلیمات میں انسانی مساوات، برابری ،انسان سے محبت ،اس کی دلجوئی اور اس کی خدمت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔صوفیا کے نزدیک خدمت خلق ہی تصوف ہے،خدا تک پہنچنے کا ایک راستہ اس کی مخلوق کی خدمت سے ہو کر گزرتا ہے۔اس بات کو اگر اس طرح بیان کریں تو درست ہو گا کہ خدا انہیں دوست رکھتا ہے جو اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں سے محبت کرتے ہیں،ان کا خیال رکھتے ہیں۔خدا کی مخلوق میں سب سے افضل مخلوق اشراف المخلوقات یعنی سب سے افضل انسان ہیں،چاہیے وہ کسی بھی رنگ کا ہو،کسی بھی مذہب کا ہو،کوئی بھی زبان بولتا ہو،کہیں کا بھی رہنے والا ہو،اس انسان سے محبت کرنا،اس کا خیال رکھنا،اس کے کام آنا،صوفیا نے اسے عبادت کا درجہ دیا ہے۔

اسلام امن وسلامتی کا مذہب ہے اور اسی طرح دنیا والوں تک اسلام کا پیغام پہنچانے والے حضرت محمد ﷺ دونوں جہانوں کے لیے رحمت ہیں۔یہی وہ امن وسلامتی کا پیغام ہے، جسے صوفیا کرام نے بڑی شد و مد سے دنیا والوں تک پہنچایا ہے۔[1]

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ صوفیا نے انسانی برابری، آپس میں بھائی چارے اور بلا امتیاز مذہب وملت،انسانیت کی بے شمار خدمت کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اور کیا ہے،وہ سب ان صوفیا کا اپنا خیال اور فکر ہے لیکن ایسا نہیں ہے یہ ایک بے بنیاد خیال ہے۔سچ تو ہے کہ ہمارے صوفیا نے دین ودنیا میں جو بھی مقام حاصل کیا ہے جس کی وجہ سے مختلف مذاہب کے ماننے والے ان کا احترام کرتے ہیں،ان سے محبت کرتے ہیں،وہ دراصل اسلام ہی کی دین ہے۔ پاکستان میں صوفیا کرام کے قافلہ سالار حضرت بابا فرید گنج شکرؒ جن کی زندگی اور پیغام میں ہماری مشکلات کا حل نظر آتا ہے۔انہوں نے ایک ایسے معاشرے میں جنم لیا جو اکثیر المذہب، کثیر القومی، کثیر السانی اور توہمات کی زد میں تھا۔انسانی زندگی کی کوئی وقعت نہ تھی۔ بادشاہی نظام کو لوٹ کھسوٹ اور جنگ وجدل میں انسانی ایندھن بلا دریغ استعمال ہوتا تھا۔ان حالات میں بابا فریدؒ نے اعلیٰ مقاصد کی تعلیم کی۔رواداری کی تعلیمات پر زور دیا۔ علم وحکمت کی طرف لوگوں کو مائل

---

[1] طالب، گوُربچن، **بابا شیخ فرید الدین گنج شکر**،(پیٹیالہ: بابا فرید میموریل سوسائٹی، 1973)، ص33۔

کیا۔ زمین سے پیار کرنے اور امن کے ساتھ زندگی گزارنے کا درس دیا۔ بابا فریدؒ کے اس عمل سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ انہوں نے ہر دم لوگوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہوئے انہوں نے ہندوستان کی زمین میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کے ذریعے لوگوں کے دلوں کو اسلام کے نور سے منور کرتے رہے اور لوگوں کے درمیان امن، محبت و رواداری کو فروغ دیتے رہے۔

صوفیا کرام محبت امن اور رواداری کی تعلیم کو پھیلانے میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں، اور انہوں نے ہمیشہ لوگوں کو بلا امتیاز رنگ و نسل اور بلا امتیاز دین و ملت ایک دوسرے کے ساتھ حسن اخلاق کی تعلیم دی اور اس کی مثالیں بھی پیش کیں۔ جن کی بدولت برصغیر کے ہندوؤں اور دیگر اقوام نے دین اسلام قبول کر کے اپنی زندگیاں دونوں جہانوں میں روشن کیں۔ ان صوفیا کرام نے عملی تعلیمات کے ساتھ ساتھ اپنے اقوال اور اپنی شاعری کے ذریعے بھی لوگوں کے دلوں میں گھر کی لیا۔ یہ ہی وہ لوگ تھے۔ جنہوں نے اسلام کو عملی طور پر اپنایا اور پھر دین اسلام کی اشاعت کی۔

مختلف مذاہب کی باہمی خیر سگالی کی تاریخ میں اس قسم کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ ایک مذہب کے پیروکار کسی دوسرے مذہب کے بزرگ صوفی یا درویش کے کلام کو اپنا مذہبی کلام سمجھیں اور اس کا ورد کریں۔ اس کی وجہ حضرت شیخ بابا فریدؒ کے کلام کی ہمہ گیری اور ہم آہنگی کی حصوصیت ہے۔ بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے اشعار میں سے ہم اُن اشعار کو زیر بحث لائیں گے جو ہمارے موضوع امن، محبت و رواداری پر مشتمل ہے۔

صبر منجھ کمان اے صبر کا فی ھنو　　صبر سندا بان خالق خطانہ کری۔[1]

ترجمہ: جس شخص کے دل میں صبر کی کمان ہو، صبر کا چلہ ہو اور صبر کا ہی تیر ہو تو خدا اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا۔

بابا فریدؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ برحق صبر کا پھل ضرور دیتا ہے۔

صبر ایہو سواوجے توں بندہ دڑھ کرے　　ودھ تھیوے دریاؤ ٹٹ نہ تھیوے واہڑہ۔[2]

ترجمہ: اے بندے صبر ہی زندگی کا حاصل ہے۔ اگر تو صبر پر کامل یقین رکھے گا۔ تو ایک دریا کی صورت اختیار کرے گا، یعنی باصبر زندگی سے تو ساری دنیا پیار پائے گی۔ تیرا دل دریا ہو جائے گا۔ اس کے برعکس جو تو صبر کا دامن چھوڑے گا۔ تو ایک چھوٹے نالے کی مانند ہو جائے گا۔

[1] Guru Granth Sahib, (S. Gurbachan Singh Bedi), 5905.
[2] ibid, 5906.

بابا فرید الدین گنج شکرؒ نے اپنے صبر پر مشتمل اشلوکوں میں لوگوں کو اس طرف راغب کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک بندے میں صبر کا مادہ موجود ہو گا تو وہی شخص کامیاب ہے زندگی کے ہر میدان میں، اور اللہ بھی ایسے بندے پر مہربان ہوتا ہے جو اس کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل پیرا ہو۔

فریدا جو تیں مارن مکیاں تناں نہ مارے گھم　　آنپرے گھر جایکے پیر تنادے چم۔[1]

ترجمہ: اے فریدؒ! جو تجھے زدوکوب کرنا چاہتے ہیں یعنی جو تجھے تکلیف دینا چاہتے ہیں، تو ان سے انتقام نہ لے بلکہ ان کے درِ دولت پر جا کر ان کی قدم بوسی کر یہ حلم وانکساری کی انتہا ہے۔

اس شعر میں بابا فریدؒ اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ اے فریدؒ اگر کوئی تیری ذات کو دکھ دے اور تو سخت تکلیف میں بھی ہو تو تُو نے تکلیف دینے والے کو کچھ نہیں کہنا بلکہ تو نے اس کو معاف کر کے اس کے ساتھ محبت کا معاملہ کرنا ہے۔

فریدا من میدان کر ٹوٹے بٹے ڈھاہ　　اگے مول نہ آوسی دوجک سندی بھاہ۔[2]

ترجمہ: اے فریدا! اپنے دل کو صاف وہموار کر اور راستے میں آنے والے تمام گڑھوں کو مسمار کر دے۔ ایسا کرنے سے تو دوزخ کی آگ میں نہ جلے گا۔

اس شعر میں بابا فریدؒ نے اپنے دل کو صاف کرنے کو کہا ہے اور کہا کہ اگر تو اپنے دل کی نفرتوں کو صاف کر دے گا تو تیرے سب کام آسان ہو جائے گئے اور یہ سب کام تیرے جنت میں جانے کا سبب بنے گئے۔

فریدا بُرے دا بھلا کر غصہ من نہ ہنڈھائے　　یہی روگ نہ لگی پلے سمجھ کچھ پائے۔[3]

ترجمہ: اے فرید! تو بد انسان سے بھی نیکی کا برتاؤ کر۔ اس کے لیے دل میں کسی قسم کا کینہ اور بغض نہیں رکھنا چاہیے۔ اگر تو اس طرح کرے گا، تو تُو کسی مرض میں مرض میں مبتلا نہیں ہو گا اور ہمیشہ خوش رہے گا اور اپنے حصول کو پائے گا۔

بابا فریدؒ کے اشعار میں اپنے آپ کو درست کرنے اور نفرت کو ختم کرنے پر زور دیا ہے۔ اس شعر میں بھی بابا فریدؒ دوسروں کے ساتھ نیکی کی تلقین کر رہے ہیں۔ اور محبت کو عام کرنے کی تلقین کر رہے ہیں۔

---

[1] Guru Granth Sahib, (S. Gurbachan Singh Bedi), 5881.
[2] ibid, 5895.
[3] ibid, 5896.

اک پھکانہ گالائے سبھناں میں سچا دھنی بیاؤنہ کہی ٹھاہ مانک سبھ اَمولویں۔[1]

ترجمہ: کسی کے ساتھ بے رُخی سے مت بولو، ہر انسان میں وہ سچا مالک بستا ہے۔ کسی کا دل مت توڑو کیوں کہ سب انسان بیش بہا موتی ہیں۔

اس شعر میں بابا فریدؒ دل آزاری سے پرہیز کرنے کا حکم دے رہے ہیں کہ سب انسان اللہ کی مخلوق ہیں کسی کے ساتھ بُرا نہ کرو، نہ غیر مذہب سمجھ کر اور نہ ہی غیر سمجھ کر، بلکہ ہم سب انسان ہیں اور ایک اللہ کے بندے اور وہ ہی سب کے دلوں میں موجود ہے۔

برہا برہا اکھیے، برہاتوں سلطان فریدا، جت تن برہ نہ اُپجے سو تن جان مسان۔[2]

ترجمہ: فرید جی فرماتے ہیں۔ برہ ایک بادشاہ ہے۔ انسان میں اگر محبت نہیں تو وہ ایک شمشان قبرستان کی طرح ہے۔

سبھان من مانک، ٹھاہن مول مچانگوا جے تو پریا دی سک ہیاؤنہ ٹھاہیں کہیں دا۔[3]

ترجمہ: سب کا دل موتی ہوتا ہے اسکا توڑنا اچھا نہیں۔ اگر تو محبوب سے ملنے کی خواہش رکھتا ہے تو کسی کا دل نہ توڑ۔

ان مندرجہ بالا اشعار میں بابا فریدؒ محبت کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ دلوں کو نہ توڑنے اور کسی کو ناراض نہ کرنے کی تلقین کر رہے ہیں کہ ان دلوں میں اللہ کا گھر ہوتا ہے کسی کا دل نہ دکھاؤ۔ اگر تمہیں کسی نے دکھ دیا ہو تو اس کو معاف کر دو۔ اسی عمل سے تم سے اللہ خوش ہو جائے گا اور وہ تمہارے قریب ہو جائے گا اور تمہیں اُس کو دیدار نصیب ہو گا۔

بابا فریدؒ کے حالات زندگی اور انکی شاعری کے اس مختصر جائزے سے بابا فریدؒ کی شخصیت کا جو تصور ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ محبت، امن و رواداری کا پرچار کرنے میں لگے رہے وہ اس بات کے قائل نہیں تھے کہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو ناپسند کیا جائے اور ان سے کوئی تعلق نہ رکھا جائے بلکہ بابا فریدؒ کا یہ موقف ہے کہ اُن کے ساتھ محبت و رواداری کا مظاہرہ کیا جائے تاکہ وہ متاثر ہو کر دین اسلام کو قبول کریں اور ایسا ہی ہوا، بہت سے غیر مسلم بابا فریدؒ کی تبلیغ کی وجہ سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔

مندرجہ بالا اشعار میں بھی بابا فریدؒ امن، محبت و رواداری کی تلقین کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ جو شخص صبر سے کام لیتا ہے اور دوسروں کو برداشت کرتا ہے آخر کار فتح اُسی شخص کی ہوتی ہے اور صبر کرنے سے معاشرے میں

[1] Guru Granth Sahib, (S. Gurbachan Singh Bedi), 5908.
[2] ibid, 5887.
[3] ibid, 5908.

محبت اور امن کو فروغ ملتا ہے جس سے تمام افراد ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں۔ بابا فریدؒ کی تعلیمات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے۔ ہمیں ہر شخص سے اچھائی کرنی چاہیے، چاہے وہ شخص آپ کے ساتھ برا سلوک کرے۔ ہمیں اپنے رویے میں نرمی پیدا کر کے اُس کا دل جیت لینا چاہیے۔ بابا فریدؒ نے اپنی تعلیمات کے ذریعے معاشرے میں امن و سلامتی کی فضا قائم کی۔اُن کی تعلیمات ہر ایک لے لیے یکساں تھی اور ہر ایک کو اُن کے پاس جانے کی اجازت تھی جو کہ انسان دوستی اور مساوات کی ایک بہترین مثال ہے۔انہوں نے شاعری کے ذریعے اپنے دل کی لوگوں تک پہنچائی اور لوگوں نے اس کو دل سے تسلیم بھی کیا۔اس پر عمل پیرا ہو کر معاشرے کو پُر سکون بنایا۔

فصل دوم: مولانا رومؒ کی تعلیماتِ امن ورواداری

مولانا کے مزاج میں زبردست قناعت تھی۔امراءاور صاحبان اقتدار طرح طرح کے تحفے بھیجتے تھے۔ مگر مولانااپنے پاس کچھ نہ رکھتے تھے سب بانٹ دیتے۔ جس دن گھر میں کچھ کھانے کو نہ ہوتااُس دن خوش ہوتے اور کہتے کہ آج میرے گھر سے درویشی کی بُو آرہی ہے۔ مولانا کی طبیعت میں فیاضی اور ایثار بھی ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو ہے۔ کبھی کسی سائل کو خالی نہیں بھیجا کوئی سوال کرتاتوبدن پر جو کچھ بھی ہوتااُتار کردے دیتے۔

جہاں مولانا رومؒ کے مزاج میں قناعت ،فیاضی اور ایثار جیسے جذبے نمایاں ہیں ۔اُدھر ہی عفوودر گزر ،محبت،پیار،صبر اور برداشت جیسی تعلیمات بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔نہ صرف مشرق بلکہ مغرب میں مولانا کی تعلیمات کوپڑھاجاتاہے،اوران سے لوگ مستفید ہوتے ہیں۔ مولانا رومؒ ہر شخص خواہ وہ اعلیٰ ہو یاادنی، عام ہو یاخاص یکساں سلوک کرتے تھے،اور کسی قسم کافرق نہیں رکھتے تھے۔ صرف انسانوں کے ساتھ ہی نہیں جانوروں کے ساتھ بھی ان کا سلوک نہایت رحمدلانہ تھا۔ایک دفعہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ جارہے تھے کہ ایک تنگ گلی میں ایک کتاسو رہاتھاجس سے راستہ رک گیاتھا۔ مولانااسے دیکھ کر وہیں رک گئے اور دیر تک کھڑے رہے،ادھر سے ایک شخص آیا اس نے کتے کوہٹادیامولانانہایت آزردہ ہوئے اور فرمایاکی ناحق اس کوتکلیف دی۔[1]

مولانا جلال الدین رومیؒ جیسی شخصیت کی تعلیمات میں امن، محبت اور رواداری کا عنصر نمایاں ہے،اِن کے خیال میں جہاں محبت اور صبر سے کام لیاجائے۔وہاں سے آپ ہر کام کرواسکتے ہیں۔ جس طرح نبی کریم ﷺ نے سخت دل عربوں کے دل نرم کردیے اور آخر کاراُن سے اپنی بات یعنی اللہ تعالیٰ کے احکامات کو تسلیم کروایا۔ بلکل اسی طرح مولانا کہتے ہیں ہم اپنے طرزِ عمل اور نرم لہجے سے دوسروں کے دل جیت کر امن اور رواداری کو اپناتے ہوئے،اس دنیااور دوسری دنیامیں کامیاب ہوسکتے ہیں۔

مولانا رومؒ کے اشعار میں امن، محبت صبر اور برداشت کی تعلیمات نمایاں ہیں۔ جن کوپڑھ کراوراُن پر عمل پیراہوکر ہم ہر میدان میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ ویسے تومولانا کی مثنوی میں قرآن اور حدیث کی مدد سے ہر حکایت کو

[1] ندوی، مولانا جلال الدین رومی، ص54۔

بیان کیا گیا ہے۔ مگر چند جگہ انہوں نے روز مرہ کی مثالوں کو زیرِ بحث لا کر اپنی تعلیمات کو واضح کیا ہے۔ اس بحث کو مدِ نظر رکھتے ہوئے صرف اور صرف اُن اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے، جو امن، محبت اور رواداری پر مشتمل ہیں۔

گر تو اشکالی بگلی و خرج　　صبر کن کالصبر مفتاح الفرج۔[1]

ترجمہ: اگر تو مجسم اشکال اور تنگی ہے۔ تو صبر کر، صبر کشادگی کی کنجی ہے۔

اے برادر صبر کن بر دردنی　　تا رہی از نیشِ نفس گبر خویس۔[2]

ترجمہ: اے بھائی سوئی کے درد پر صبر کر۔ تاکہ تو اپنے بے دین نفس کے ڈنک سے نجات پائے۔

گفت پیغمبر خدا اش ایمان نہ دار　　ہر کرا صبرے نہ باشد در نہاد۔[3]

ترجمہ: پیغمبر نے فرمایا خدا نے اسکو ایمان عطا نہیں کیا ہے۔ جس کی فطرت میں صبر کرنا نہ ہو۔

ہر کرا بینی یکے جامہ درست　　وآنکہ او آں را بہ صبر و کسب جست۔[4]

ترجمہ: تو جس کسی کا لباس اچھا دیکھے، تو سمجھ لے کہ اُس نے وہ صبر اور کمائی سے حاصل کیا ہے۔

ہر کرا بینی برہنہ و بنیوا　　ہست بر بے صبری او آں گوا ۔[5]

ترجمہ: تو جس کو ننگا اور محتاج دیکھے، تو وہ اُس کی بے صبری پر گواہ ہے۔

صبر و خاموشی جذوبِ رحمت است　　ویں نشاں جُستن نشانِ علت است

ترجمہ: صبر اور خاموشی رحمت کو کھینچنے والی ہے۔ اور یہ دلیل طلب کرنا ہماری بیماری کی علامت ہے۔

---

[1] رومی، جلال الدین، **مثنوی معنوی**، (رینولد الین نیکلسون، س ن) دفتر اول، ص148۔

[2] ایضاً: 168/1۔

[3] رومی، **مثنوی معنوی**، دفتر دوم، ص230۔

[4] ایضاً: 1032/6۔

[5] رومی، **مثنوی معنوی**، دفتر ششم، ص1055۔

گفت لقماں صبر نیکو ہمدمیست　　کو پناہ و رافع ہر جا غمیست۔[1]

ترجمہ: لقمان نے فرمایا کہ صبر اچھا ساتھی ہے۔ کیونکہ وہ ہر مقام پر غم کی پناہ اور دافع ہے۔

چوں صبوری پیشہ کرد ایوب راد　　از بلا او را درِ رحمت کشاد۔[2]

ترجمہ: جب بہادر ایوبؑ نے صبر کرنے کو پیشہ بنایا، تو مصیبت سے اُن کے لیے رحمت کا دروازہ کھل گیا۔

صبر صدر آمد بہر حالت کہ ہست　　صبر را گلزار تا بتواں زدست۔[3]

ترجمہ: جو حالت بھی ہو صبر، صدر ثابت ہوا ہے، جب تک ممکن ہو صبر کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔

مندرجہ بالا اشعار میں مولانا رومؒ صبر کی اہمیت واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے بندے اگر تو صبر کریں گا تو اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم کریں گا اور تجھے کشادگی حاصل ہو گی۔ صبر ایک ایسی چیز ہے جس کے کرنے سے تو اپنے بُرے نفس سے بچ سکتا ہے۔ صبر کرنے والے اللہ تعالیٰ خوش ہوتے ہیں، اور ایسے ہی لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنت کی بشارت دی ہے۔ جس طرح نبی کریم ﷺ نے کفار کی اذیتوں کو صبر و تحمل سے سنا اور کبھی اللہ تعالیٰ سے شکوہ نہ کیا، اور آخر اللہ تعالیٰ نے پورا عرب نبی کریم ﷺ کے حکم پر سر تسلیم خم کرنے لگا۔ صابر بندے کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ زبان کا استعمال کم کرتا ہے، یعنی اللہ سے شکوے نہیں کرتا جس سے وہ رحمتِ خداوندی کا حق دار ہو جاتا ہے۔

از محبت تلخہا شریں شود　　از محبت مسہا زریں شود۔[4]

ترجمہ: محبت کی وجہ سے کڑوی چیزیں میٹھی ہو جاتی ہیں، محبت سے تانبے سونے بن جاتے ہیں۔

از محبت خارہا گل می شود　　وز محبت سرکہا مل می شود

ترجمہ: محبت سے کانٹے پھول بن جاتے ہیں، محبت سے سولی تخت بن جاتا ہے۔

از محبت سُقم صحت می شود　　وز محبت قہر رحمت می شود

ترجمہ: محبت سے بیماری، تندرستی بن جاتی ہے، محبت سے قہر رحمت بن جاتا ہے۔

---

[1] رومی، **مثنوی معنوی**، 483/3۔

[2] ایضاً: 1055/6۔

[3] رومی، **مثنوی معنوی**، دفتر ششم، ص 1055

[4] ایضا، ص 1056۔

ان اشعار میں مولانا رومؒ نے محبت کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ محبت ایک ایسی چیز ہے جس کی بدولت ہم بڑے بڑے کام کر سکتے ہیں۔ محبت کے کچھ تقاضے ہیں اگر ہم اُن کو پورا کر لیں تو یہ جہاں جنت کا منظر پیش کرے گا۔ سخت دل انسان بھی نرم پڑ جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اگر حاصل کرنا ہے تو اُس کی مخلوق سے محبت کرنی چاہیے۔ مولانا روم نے سخت دل انسان کو نرم دل بنانے کا نسخہ بھی بتادیا ہے کہ اُس شخص سے محبت سے پیش آو تو وہ بھی نرم دل ہو جائے گا۔ محبت کی شیرنی ایسی ہے کہ جس نے بھی چکھی اُس کو اس کا اثر ہمیشہ محسوس ہوتا رہا۔

زانکہ خوشخوآں بود کودر خُمول   باشد از بدخوی وبدطبعاں حمول۔[1]

ترجمہ: کیونکہ اچھی عادت والا وہ ہے جو گوشہ تنہائی میں، بدعادت اور بدطبیعت والوں کو برداشت کرنے والا ہو۔

اس شعر میں مولانا رومؒ دراصل رواداری کو فروغ دے رہے ہیں۔اُن کا کہنا ہے کہ بہتر بندہ وہ ہے جو دوسروں کو برداشت کریں، اگر وہ اُس کو کوئی ناپسندیدہ بات بھی کہہ دے تو اُس کو خاموشی سے سنے اور برداشت کریں۔ ہمارے مذہب کی تعلیمات میں کا ایک اہم حصہ رواداری پر مشتمل ہے۔اس لیے ہمیں اسی سمت چلنا چاہیے۔ جس سمت ہمیں ہمارا دین حکم دیتا ہے۔

رنجِ یک جزوے تن رنجِ ہمہ ست   گردم صُلح ست یاخود ملحمہ است۔[2]

ترجمہ: جسم کے ایک جزو (عضو) کی تکلیف سب کی تکلیف ہے خواہ وہ صلح کا وقت ہو یا جنگ کا۔

دست کورانہ بحبل اللہ زن   جز برامر و نہی یزدانی متن[3]

ترجمہ: اندھادھند اللہ کی رسی پر ہاتھ ڈال، خدائی امر و نہی کے سوا ارادہ نہ کر۔

اس شعر میں مولانا رومؒ اخوت و بھائی چارے کا پیغام دی رہے ہیں۔ کہ جس طرح جسم کے ایک حصے میں درد ہو تو پورا جسم درد محسوس کرتا، بلکل اسی طرح ہم امتِ مسلمہ کو متحد اور یکجا ہو جانا چاہیے۔اس طرح بیرونی طاقتیں جو ہمیں نقصان پہچانے کے درپہ ہیں، وہ اس سازش میں ناکام ہو جائے۔

---

[1] رومی، **مثنوی معنوی**، دفتر چہارم، ص450۔

[2] ایضاً:631/4۔

[3] ایضاً:1085/6۔

مندرجہ بالا اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ مولانا کی تعلیمات کا بیشتر حصہ اس بات کا پرچار کرتے ہوئے گزرا کہ محبت اور امن سے زندگی گزار کر دیکھو یہ جنت کا منظر دے گی۔ مزید مولانا کے اشعار سے یہ پتہ لگتا ہے کہ صبر ایسی صفت ہے جو انسان کو بڑی سے بڑی مصیبت برداشت کرنے کی طاقت عطا کرتی ہے۔ انسانی زندگی میں کتنے ہی ایسے واقعات پیش آتے ہیں۔ جن کو اگر ہم صبر سے برداشت کرے تو ہم میں اور دوسری بہت سی خوبیاں خود بخود آجاتی ہیں۔ قرآن پاک بھی صبر کرنے والوں کو خوش خبری دیتا ہے۔ صبر انبیاء و کاملین اور واصلین کی خاص صفت ہے۔

مولانا رومؒ پر نہ صرف مسلم مصنفین نے بہت کچھ تحریر کیا ہے بلکہ غیر مسلموں نے بھی آپ کی تعلیمات سے مستفید ہوئے۔ کولمن بارکس نے مولانا پر جو کتاب لکھی اُس میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"Rumi says an ecstatic human being is a polished mirror that cannot help reflecting.what we love,we are.As the heart comes cleaner,we see the kingdom as it is.we becomes reflected light.rumi says the polishing is done by the intensity of our longings.It is so difficult to remembare who we are and to act from there"[1].

رومی کا کہنا ہے کہ پر جوش انسان ایک چمکدار آئینہ کی طرح ہے، جو کسی بھی چیز کو منعکس کرنے میں مدد نہیں کر سکتا۔ ہم جس سے محبت کرتے ہیں، اگر ہمارا دل صاف ہو تو ہم اُس اُس طرح اس کو دیکھ سکتے ہیں۔ اور پھر ہم روشنی بن جاتے ہیں۔ اور رومی کا کہنا ہے کہ چمکداری ہماری شدت پر ہوتی ہے اور جو چمک ہمارے اندر پیدا ہوتی ہے وہ مشقوں کا حاصل ہوتی ہے۔

مولانا نے مثنوی شریف میں جابجا صبر و ضبط پیدا کرنے پر زور دیا اور اس کو کیمیاء جیسی اہم اور ضروری چیز قرار دیا ہے۔ مولانا کی آفاقی اقدار، فکری بصیرت اور غیر معمولی قوتِ مشاہدہ نے ان کی تعلیمات کو ہر زمانہ کے لیے اہم اور معنوی ثابت کر دیا ہے۔ اس بنا پر وہ ماضی حال مستقبل کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔

---

[1]. Coleman Barks, *Rumi: The Book of Love: Poems of Ecstasy and Longing*, (New York: HarperCollins,2002), 92.

فصل سوم: بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کی تعلیماتِ امن و رواداری کے اثرات کا جائزہ

ماحول کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے اور مکان و زمان کی تبدیلیوں سے عہدہ بر ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے دو انتظامات فرمائے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس نے نبی کریم ﷺ کو ایسی کامل و مکمل اور زندہ تعلیمات عطا فرمائی ہیں۔ جو ہر کشمکش اور ہر تبدیلی کا باآسانی مقابلہ کر سکتی ہیں۔

شیخ فرید الدین گنج شکرؒ جس دور میں پیدا ہوئے، اور جوان ہوئے وہ عالم اسلام کا انحطاط بلکہ ایک تمدن کی مکمل تباہی کا عہد تھا۔ اسلامی دنیا پر تاتاریوں کے ایک صدی کے مسلسل حملوں نے مسلمانوں کی ملک گیری اور اس کے استحکام کے عمل کو جو اپنی ترقی کی ساتویں صدی میں داخل ہو چکا تھا۔ پہلا دھکا لگایا اور یہ ان کی ترقی کے تسلسل کو درہم برہم کرنے والا عظیم سانحہ تھا۔ چنگیز خان کے بے شمار حملوں کے دوران بہادر مسلمان حکمران جلال الدین خوزرام شاہ کا پیچھا کرتا ہوا، ہندوستان اور ملتان تک پہنچا۔ چنگیز خان نے البتہ ہندوستان سے آگئے آنے کی ہمت نہ کی۔ تاتاریوں کا خوف ہر ایک حاکم کے دل میں بیٹھ چکی تھی اور بہت سی حکومتیں تاتاریوں نے ختم کر لی تھی۔ یہ اس وقت کا قصہ ہے جب بابا فریدؒ کو ملتان سے متصل اجودھن کے مقام پر قیام پر تھے۔ جہاں وہ نیم مہذب قبائلوں میں خدا پرستی کے پرچار کی اہم خدمت انجام دے رہے تھے۔ منگولوں نے اوچ اور سندھ کے صوبے دار نصیر الدین قباچہ[1] کو زچ کیا تھا۔ یہ اُن دنوں کا واقع ہے جب شیخ فریدؒ کے جوانی کے دن تھے۔ اگر دیکھا جائے تو بابا فریدؒ کی پیدائش کے وقت ایک تو ہندوستان میں اسلام آچکا تھا، اور پھر جب آپ اپنی جوانی کے حصہ میں آئے تو اُس وقت ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ حکومتیں گر رہیں تھیں اور خون ریزی کا عالم تھا۔ ایسے حالات میں کسی ایسی شخصیت کا آنا بہت ضروری تھا۔[2] جو لوگوں کے لیے حوصلہ مند ثابت ہو اور ان کے درمیان ایسی تعلیمات کو عام کریے جو امن، محبت اور رواداری پر مشتمل ہو، اور وہ بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی ہی ذات گرامی تھی۔ جس نے نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کو سامنے رکھ کر ایسے حالات میں لوگوں کی رہنمائی کی اور ان کے درمیان محبت و امن کو پھیلایا۔[3]

---

[1] ناصر الدین محمود (وفات: 18 فروری 1266ء) سلطنت دہلی کا آٹھواں سلطان رہا جس کا تعلق خاندان غلاماں سے تھا۔ وہ شمس الدین التمش کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا اور علاؤالدین مسعود کی جگہ تخت پر بیٹھا۔ مزید تفصیلات کے لیے؛
https://pantheon.world/profile/person/An-Nasir_Muhammad

[2] آنند، بلونت سنگھ، **فرید نانک بلھا**، (لاہور: المطبعہ العربیہ، 2008)، ص 85۔

[3] گور بچن سنگھ، **بابا فرید الدین گنج شکر حالاتِ زندگی اور تعلیمات**، ص 18

ساتویں صدی کا بڑا حصہ مولانا کا عہد ہے، اور ساتویں صدی ہجری خاص طور سے مسلم تاریخ کا تاریک اور خطرناک دور ہے۔ مسلم دنیا کے لیے یہ سخت آزمائش اور تکلیف دہ دور تھا۔ جان ومال اور عزت غیر محفوظ تھی۔ مسلسل ریزی اور فتنہ فساد نے لوگوں کے دل پتھر کر دیئے تھے۔ ایک ہی آبادی اور ایک ہی قوم کے لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اور اس چیز کے اثرات اتنے دور تک جا پہنچتے تھے کہ بعض اوقات حکومت بھی اس سے اثرانداز ہو جاتی تھی۔ ترکستان، ایران، عراق مصر، شام، روم اور حجاز سب ایک ہی کشتی میں سوار تھے۔ تاتدی یلغار نے قریب قریب پوری مسلم دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ بلخ، رے، ہمدان، قزوین، مرو، نیشاپور اور خوارزم جیسے عالم اسلام کی پیشانی کی مانند تھے سب ختم ہو کر رہ گئے۔ اسی صدی کی ابتداء میں امام رازی نے انتقال کیا تھا۔ جنہوں نے علم الکلام کا صور اس انداز سے پھونکا تھا کہ اس کے علاوہ اور کوئی اور آواز سننے کو نہ ملتی تھی۔ کسی بھی چیز کی کوئی حقیقت تسلیم نہیں کی جاتی تھی، نہ دین کی حقیقت اور نہ عقیدہ کی حقیقت جب تک کہ اس کو دلائل اور منطقی ترتیب اور فلسفیانہ مقدمات سے ثابت نہ کیا جائے۔ ان بحثوں نے عالم اسلام کو ایک مدرسہ کی شکل تو دے دی تھی جس میں قیل قال تو تھا۔ مگر محبت اور معرفت اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا مادہ ختم ہو چکا تھا۔[1]

ایسی حالت میں عالمِ اسلام کو ایک ایسی بلند اور طاقت ور شخصیت کی ضرورت تھی۔ جو اپنی گرمی عشق اور محبت بھرے پیغام سے عالم اسلام میں ایک نئی روح پھونک دے۔ جو اپنی تعلیماتِ امن ورواداری اور پیغامِ محبت سے معاشرے کے لوگوں کو پھر سے یکجا کر دے اور ان کو ایک اللہ کے دین پر عمل پیرا ہونے اور ایک راستے اختیار کرنے میں معاون ثابت ہو۔ اور یہ شخصیت مولانا جلال الدین رومیؒ کی تھی۔ جنہوں نے آکر اپنی تعلیمات کے ذریعے معاشرے میں امن وسکون اور محبت ورواداری کی فضا قائم کیں۔

بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی تعلیماتِ امن ورواداری کے اثرات کا جائزہ

بابا فریدؒ جن کا نام پنجاب میں آٹھ سو سال سے نہایت عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ ایک صوفی اور روحانی رہنما تھے۔ بابا فریدؒ کا کلام تنگ دلی اور فرقہ واریت کو مٹاتا ہے۔ اس کی بنیاد تمام بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود پر رکھی گئی ہے۔ انہوں نے ہندوستان کے مختلف مذاہب و فرقوں میں موافقت و یگانگت پیدا کرنے کی تحریک بھی اپنی تعلیمات سے چلائی۔

---

[1] خاں، **افکار رومی**، ص 11۔

معاشرتی لحاظ سے اثرات کا جائزہ

بابا فریدؒ تبلیغ اسلام کے لیے صرف پنجاب میں ہی نہیں بلکہ شمالی ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچے۔اجودھن کو تیس سال اپنی روحانی کرنوں سے سب کو مستفید کیا۔زمانہ وسطیٰ کا اجودھن رہائش کے لحاظ سے ایک پُر خطر علاقہ تھا۔دریائے ستلج کے کنارے اجودھن کے گرد صحرائی علاقہ تھا۔یہاں کے لوگ ان پڑھ، گنوار اور کافر تھے۔بیشتر ہندؤ قبائل سخت اور جنونی تھے۔یہاں مردہ شوہر کے ساتھ ستی ہونے یعنی زندہ آگ میں جل جانے کی رسم عام تھی۔ان بھٹکے ہوئے اجڈ قبائل کو راہ حق پر لانا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔لیکن بابا فریدؒ نے ہمت نہ ہاری اور ان لوگوں میں رہنے کو زیادہ ترجیح دی نسبت اس کے کہ وہ دہلی جیسے بادشاہوں کے شہر میں رہتے۔اور انہوں نے اپنی تعلیمات کے ذریعے ان لوگوں کے دلوں کو اسلام کی طرف راغب کیا۔

بابا فریدؒ ہندوؤں سے خوش اخلاقی سے پیش آتے، چونکہ اجودھن کا بیشتر علاقہ ہندوؤں پر مشتمل تھا۔اور یہ لوگ اپنے مذہب پر سختی سے کاربند تھے۔آپ ہمیشہ ان سے خوش اخلاقی اور تواضع سے پیش آتے اور یہ آپ کی مذہبی رواداری اور حسن سلوک ہی تھا جسکے نتیجے میں سیال، میو، وٹو، راجپوت، نون، ٹوانے، گوندل، کمبوہ، کھوکھر، جولاہے، ماچھی سمیت سولہ بڑے قبائل اسلام کے دامن عافیت میں آ گئے۔[1]

نبی کریم ﷺ نے بھی غیر مسلموں سے حسن سلوک کا برتاو کیا اور اُن کے دلوں کو اسلام کے نور سے منور کیا۔بابا فریدؒ نے نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کو مشعلِ راہ بنایا اور اجودھن کے کافروں سے حسنِ سلوک سے پیش آ کر اُن کو راہ اسلام پر لایا۔

صرف بابا فرید الدین گنج شکرؒ ہی نہیں، بلکہ پورا سلسلہ چیشتیہ ہی پیغامِ امن و محبت اور رواداری کا قائل ہے۔آپ کے مریدِ خاص نظام الدین اولیاؒ نے بھی بابا صاحب کا طرز اپنی زندگی میں اپنایا، اور ہر اُس شخص سے محبت اور رواداری کا مظاہرہ کیا جو راہ امن سے دور تھا۔کیونکہ سب مریدوں میں سے نظام الدین اولیا کو، آپ سے بہت لگاؤ تھا۔چنانچہ حضرت نظام الدین اولیا کو بابا فریدؒ نے پہلا سبق یہی دیا تھا کہ اپنے دشمنوں کو خوش کرنا چاہیے۔[2]

---

[1] کشمیری لال ذاکر، **حضرت بابا فرید شخصیت اور فن**، ص26۔

[2] گوربچن سنگھ، **بابا فرید الدین گنج شکر حالاتِ زندگی اور تعلیمات**، ص22۔

حضرت چراغ دہلی پر جب تراب قلندر نے حملہ کیااور چاقو سے اتنا گہرا زخم لگایا کہ حجرے سے خون بہتا ہوا نالی کے راستے سے باہر جانے لگا تھا۔ آپ لہولہان ہو گئے خدام نے دوڑ کر قلندر کو پکڑ لیا۔ مگر آپ نے سختی سے تاکید کر دی کہ اسے کوئی تکلیف نہ دی جائے میں نے اس کو معاف کر دیا۔ حضرت محبوب الہیٰ سے ایک شخص نے عرض کیا کہ کچھ لوگ آپ کو بُرا بھلا کہتے ہیں ہم سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔ آپ نے فرمایا میں نے سب کو معاف کر دیا۔ اور فرمایا بُرا کہنا تو آسان ہے بُرا چاہنا اُس سے بھی بدتر ہے اور عدوات کا علاج یہ تجویز کیا کہ ایک فریق اپنا دل صاف کرے دوسرے کا آزار خود کم ہو جائے گا۔ ظاہر ہے جہاں دشمنوں سے ایسا سلوک ہو گا۔ وہاں دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے میں کیا کمی ہو سکتی ہے۔[1]

مذہبی واخلاقی لحاظ سے اثرات کا جائزہ

بابا فریدؒ کی تعلیمات میں اخلاقیات کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ایک ایسے ملک اور ماحول میں جہاں مختلف مسالک و مذاہب اور رسوم و رواج کی حامل اقوام موجود ہوں۔ وہاں آپ کا اخلاقی نظام ایک ایسی مشترکہ قدر بن جاتا ہے کہ جس پر کسی خاص مذہب و نظریے کی چھاپ نہیں ہوتی۔[2]

جس کی بنا پر وہ ہر شخص کے لیے موزوں قرار پاتے ہوئے پُر کشش بن جاتا ہے۔ آپ نے انسانی رشتوں کا بڑا احترام کیا اور ہر شخص سے محبت کا اظہار کر کے اس کے دکھ درد بانٹنے کا بیڑا اٹھایا، آپ عدم تشدد کے حامی تھے۔ رواداری پیار محبت، عجز وانکساری، کشادہ دلی آپکا منشور بن گیا۔ اپنے ملنے والوں کو اعلیٰ اخلاقی اقدار کی پاسداری کا سبق دیتے، برائی کا بدلہ نیکی سے دو غصہ تھوک دو، دلوں کو رنجشوں سے پاک کر دو۔ تمہارا جسم کدرتوں سے پاک ہو جائے گا اور زندگی آسان ہو جائے گی۔

صوفیا کرام اور سلاطین کی پیری مریدی محض رسمی اور روایتی نہیں رہی۔ سلاطین کے مذہبی خیالات و جذبات کے نشو ونما میں ان بزرگوں کے فیوض و برکات کا بڑا دخل رہا۔ شمس الدین التمش حضرت خواجہ بختار کاکیؒ کا مرید تھا اور وہ ویسا ہی تھا جس طرح خواجہ صاحب خود تھے۔ شمس الدین راتوں کو جاگتا کسی نے اس کو سوتے نہیں دیکھا، وہ بیدار ہو کر عالم تحیر میں کھڑا رہتا۔ اور اگر سوتا بھی تو جلد بیدار ہو جاتا وضو کر کے مصلے پر کھڑا ہو جاتا۔ وہ ہمیشہ

---

[1] فاروقی، نثار احمد، **چشتی تعلیمات اور عصرِ حاضر میں ان کی معنویت**، (نئی دہلی: اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی، 1981)، ص28۔

[2] بچن سنگھ، **بابا فرید دے اشلوک**، (لاہور: پیسہ اخبار سٹریٹ، س ن)، ص56۔

نماز میں تکبیر اولیٰ سے شریک ہوتا، عصر کی سنتیں کبھی قضا نہیں کیں۔اس کی ان ہی خوبیوں کی وجہ سے حضرت خواجہ بختار کاکیؒ کی نماز جنازہ پڑھانے کی سعادت حاصل ہوئی۔[1]

سلطان ناصر الدین محمود پر اپنے باپ سلطان شمس الدین التمش کا بڑا اثر تھا۔اسی لیے اس کو علماء سے محبت تھی۔ناصر الدین کو بابا فریدؒ سے بڑی محبت اور عقیدت تھی۔سلطان ناصر نے بائیس سال تک حکومت کی،اس کی زندگی میں بھی صوفیا کی تعلیمات کا رنگ نمایاں تھا۔جب دربارِ عام میں آتا تو شاہانہ لباس میں رہتا، لیکن جب دربار ختم کرنے کے بعد پھٹے پرانے کپڑے پہن لیتا۔اس کا زیادہ تر وقت عبادت، ریاضت، تلاوت کلام پاک، شب بیداری، ذکر اللہ میں گزرتا۔اسی طرح غیاث الدین بلبن پر حضرت شیخ علی چشتؒ، حضرت بابا فریدؒ، حضرت خواجہ شمس الدینؒ اور دوسرے مشائخ کا بڑا اثر رہا۔اور یہ ان سب کی ہی صحبت کا اثر تھا کہ وہ عبادت، ریاضت، روزے، نفل اور شب بیداری میں غیر معمولی اہتمام رکھتا، نماز باجماعت پڑھتا، جمعہ کی نماز مسجد میں پڑھتا، اشراق، چاشت، اوابین اور تہجد کی بھی پابندی کرتا۔[2]

خواہ کوئی بھی موسم ہو، رات کو جاگتا۔سفر اور حضر میں وظائف کو نہ چھوڑتا، کبھی بے وضو نہ رہتا۔اسی طرح جلال الدین خلجی کو نہ صرف حضرت بو علی قلندر سے لگاؤ تھا بلکہ تمام مشائخ سے عقیدت تھی، اور اس میں غیر معمولی خدا ترسی اور نرمی ان ہی کے اثرات سے پیدا ہوئی۔اسی طرح باقی سلاطین بھی صوفیا کی تعلیمات سے متاثر ہوئے اور اُن کی تعلیمات کو اپنی زندگیوں میں شامل کر کے اُسی رنگ میں ڈھل گئے۔اور ایسے اثرات مرتب ہوئے ان پر کہ جو نسلوں تک باقی رہے۔مذہبی اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے، اگر دیکھا جائے تو ہمارے سامنے ایک زندہ مثال ہے۔اور شاید یہ مثال ہمیشہ زندہ رہے۔بابا فریدؒ کے اس کلام کو بے حد شریں، پراز جذبات اور روحانی طور پر اہم اور بلند پا کر گورو نانک نے اس کو اپنی تعلیمات میں شامل کر لیا ہے، اور بعد میں وہ اس اپنے جانشینوں و مریدوں کی ہدایت وارشاد کے لیے چھوڑ گئے۔اس وقت سے سکھوں کے درمیان آپکا کلام نہایت عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔مختلف مذاہب کی باہمی غیر سگالی کی تاریخ میں اس قسم کی مثال نہیں ملتی ہے۔ایک مذہب کے پیرو کسی دوسرے مذہب سے متعلق بزرگ صوفی کے کلام کو اپنا مذہبی کلام سمجھیں۔[3]

---

[1] سید صباح الدین عبدالرحمن، **ہندوستان کے سلاطین علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر**، (دارالمصنفین اعظم گڑھ، 1970)، ص118۔

[2] ایضا، ص120۔

[3] ایضاً، ص122۔

سیاسی اثرات کا جائزہ

حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ نے جب اجودھن کو اپنے لیے چُنا تو اُس وقت اُدھر کا ماحول رہنے کے قابل نہ تھا، لیکن آپ نے اُس ماحول کو اپنے لیے بہتر سمجھا اور دہلی جیسے پُر آسائش اور بادشاہوں کے مسکن شہر کو چھوڑ کو اس پُر خطر اور دشوار گزار علاقے میں آئے تھے۔ کیونکہ ان کی درویشانہ طبعیت دار الحکومت کی ڈپلومیسی، سیاسی گروپوں سے مطابقت نہ تھی۔ لیکن آپ نے ان سلاطین اور امراء کو اپنے پاس آنے اور اپنی تعلیماتِ امن و محبت اور رواداری سے مستفید ہونے سے نہیں روکا، بلکہ جب بھی کوئی سلطان یا حاکمِ وقت آتا تو آپ اُس کے ساتھ بھی ویسے ہی معاملہ کرتے جیسے باقی لوگوں کے ساتھ کرتے تھے۔ شیخ فریدؒ کی علمی فصیلت کی بنا پر انھیں شیخ الاِسلام اور شیخ کبیر کہا جاتا ہے۔[1]

بابا فریدؒ نے اپنی حیاتِ مبارکہ کے نوے برسوں میں دس بادشاہوں کا دور دیکھا تھا۔ پنجاب کے ایک دور اور ویران گوشے میں اقامت گزین ہونے کے باوجود کثیر تعداد میں معتقدین بادشاہ وامراء، انکی خدمت میں حصول برکت اور رشد ہدایت کے لیے حاضر ہوتے۔ بابا فریدؒ کو جو بے پایاں عظمت حاصل تھی، اسکا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے۔ جب ناصر الدین اوچ اور ملتان کی جانب گیا تو اسکا تمام لشکر بابا صاحب کی زیارت کے لیے اجودھن میں پہنچ گیا۔ جس میں ہزار ہا افواج اور عوام نے آپکی زیارت کی۔ ناصر الدین آپ کی تعلیمات سے متاثر تھا اور اکثر آپ کی خانقاہ میں حاضری کے لیے آتا رہتا تھا۔ صرف ناصر الدین ہی نہیں، بلکہ تخت پر آنے والا ہر بادشاہ ہی آپ کا دیوانہ تھا۔ غیاث الدین بلبن کو ہندوستان کا تخت آپ کی دعا سے ملا اور وہ اکثر اس بات کا اعتراف بر ملا کرتا تھا۔ نہ صرف ہندوستان کے تخت پر بیٹھنے والے بادشاہ آپ کی تعلیماتِ امن و محبت اور رواداری سے متاثر تھے۔ بلکہ جب ہندوستان پر امیر تیمور نے حملہ کیا تو وہ نواحی علاقوں کو تاراج کرتا ہوا، اجودھن میں داخل ہوا اور اس فاتح عالم نے سب سے پہلے آپ کے دربار پر حاضری دی اور امن و سلامتی کے ساتھ ادھر سے روانہ ہو گیا۔[2]

تینوں پہلوں سے مطالعہ کرنے کے بعد، ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اُس وقت کی سخت ضرورت تھی کہ بابا فریدؒ جیسی شخصیت اُس ماحول کی اصلاح نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کو سامنے رکھتے ہوئے کرے۔ بابا فریدؒ کی مندرجہ بالا کوششیں

---

[1] پریمی پرکاشک، **دوھے بابا فرید جی**، (دہلی: چاند بک ڈپو کھاری باؤلی، س ن)، ص 7۔

[2] کشمیری لال ذاکر، **حضرت بابا فرید گنج شکر فن اور شخصیت**، ص 10۔

اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ انہوں نے اپنی تعلیماتِ امن و محبت اور رواداری کو لوگوں میں واضح طور پر عام کیا اور اس سے معاشرے میں دوستانہ ماحول قائم کر کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا اور پھر ان کی اصلاح کی۔ ہندوؤں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کا رویہ رکھ کر اُن کو پہلے اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کیا، جب انہوں دیکھا کہ اسلام تو امن و سلامتی اور محبت کا دین ہے تو انہوں نے بھی اس دین کو قبول کیا۔ اور معاشرے میں امن و رواداری کی فضا کو قائم کیا۔

مولانا جلال الدین رومیؒ کی تعلیماتِ امن و رواداری کے اثرات کا جائزہ

ساتویں صدی ہجری اسلام کے لیے نہایت خطرناک تھی۔ لوگ عیش پرستی، فسق و فجور اور زوال کے گرداب میں گھر چکے تھے۔ جان و مال اور عزت کوئی چیز محفوظ نہیں تھی۔ معاشرہ بے یقینی، بیچارگی، مایوسی و خوف ہر اس کا شکار تھا۔ طوائف الملوکی تھی اور قتل و غارت گری عام تھی۔ اخلاقی لحاظ سے کسی کی کوئی حالت نہ تھی۔ خوارزمی، غوری، غزنوی و سلجوقیوں کی باہم جنگ و جدل نے دنیائے اسلام کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ شیعہ، سنی و دیگر فرقے، فسادات کے باعث برباد ہو رہے تھے۔ اس پر تاتاری یلغار نے دنیائے اسلام کو تباہی کے دہانے تک پہنچا دیا تھا۔ ایسے حالات میں ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی ایسا فردِ واحد ہو جو اس مخلوقِ خدا کو اُس راستے پر لائے جس کا حکم اللہ اور اسکے رسول ﷺ نے دیا ہے۔ اور وہ بندہ خدا تھے مولانا جلال الدین رومیؒ جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کو مدِ نظر رکھ کر معاشرے کے لوگوں کی اصلاح کی اور اُن کو دلوں میں امن و محبت اور رواداری جیسی صفات کو جنم دیا۔

معاشرتی لحاظ سے اثرات کا جائزہ

مولانا کے دور کے واقعات سے جیسا کہ آگاہ کیا جا چکا ہے کہ اُس دور میں ہر طرح سے لوگوں کی خستہ حالی تھی۔ جنگ و جدل سے جہاں لوگوں کے دلوں میں خوف و ہراس تھا وہاں ایک دوسرے کے لیے محبت کے جذبات بھی سفید پڑ گئے تھے۔ ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا مادہ ختم ہو گیا تھا۔ غلامی خواہ چند ہی روز کی کیوں نہ ہو، انسان کی بہترین صلاحیتوں کو ختم کر دیتی ہے۔ اور منگولوں کی غلامی تو یقیناً عذاب کی ایک بد ترین صورت تھی۔ مشرق میں منگول اور مغرب میں صلیبی جنگوں نے ماحول کی فضا کو امن و سلامتی اور محبت و رواداری سے خالی کر دیا تھا۔[1]

[1] عبدالباقی، جہانِ رومی، ص60۔

لیکن مولانا نے اپنی تعلیماتِ امن و رواداری سے ان مردہ دلوں کو زندہ کیا۔ مولانا نے دکھی دلوں کو محبت کی دوا پلائی اور اُن کو پھر سے زندہ کیا۔ امن وامان کی ہر کوشش کا غیر مقدم ہے۔ انسانی اخوت باہمی محبت، عالمی یکجہتی اور رواداری کے پیغام کو عام کر کے لوگوں کے درمیان پھر سے جینے کی اُمید پیدا کی۔[1]

مولانا نے اُس وقت کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے جس طرح محنت کی اُس کا ثبوت اس بات سے واضح ہوتا ہے کہ جب علامہ اقبالؒ کے دور میں لوگوں کی حالت ابتر تھی، تو انہوں نے بھی مولانا رومؒ کی تعلیمات کو مد نظر رکھ کر لوگوں کی اصلاح کی۔ مولانا رومؒ کی تعلیمات سے متاثر ہو کر لوگوں نے دوبارہ جینا شروع کیا، اور انسانیت کا احترام کرنا سکھا۔ مولانا نے اپنے اشعار کے ذریعہ جس طرح بندگان خدا کی زندگیوں میں ایک انقلاب برپا کر دیا تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

مولانا کی تعلیمات اور مثنوی معنوی نے معاشرے پر جو اثرات مرتب کیے۔ ان کا ثبوت اس طرح سے ملتا ہے کہ علامہ اقبال مولانا رومی کو اپنا پیر و مرشد تسلیم کرتے تھے۔ اور انھوں نے بار ہا اپنے کلام میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں پیرِ رومی، پیر یزدانی، پیر حقیقت سرشت اور پیرِ عجم کے نام سے یاد کیا اور ان سے عقیدت کا اظہار کیا۔ اقبال کے یہاں اکثر و بیشتر مقامات پر رومی کے موضوعات پر کلام دکھائی دیتا ہے، جیسے عشق و عقل میں عشق کو ترجیح دینا، جبر و قدر کے موضوع میں عمل اور جہد مسلسل کو بہتر جاننا یا اخلاقی موضوعات کا بیان، اقبال بڑی حد تک ایسے موضوعات میں مولانا رومی سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ اقبال نے اپنی نظم پیر و مرید میں مولانا رومی کے اشعار میں اپنی الجھنوں کا حل تلاش کیا ہے۔ اقبال رومی کی مثنوی کے عظیم خیالات سے بے حد متاثر ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے شاہ بو علی قلندر پانی پتیؒ بھی مولانا کی صحبت میں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں فرقہ قلندریہ بھی ایک درجہ میں مولانا رومی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مولانا روم کے 800ویں جشنِ پیدائش پر ترکی کی درخواست پر اقوام متحدہ کے ادارہ برائے تعلیم ثقافت و سائنس یونیسکو نے 2007 کو بین الاقوامی سالِ رومی قرار دیا۔[2]

---

[1] ایضا، ص 69۔

[2] فردوسی، ریاض، ''**مولانا روم**'' مضامین. کام، 29 اگست 2018۔

سیاسی لحاظ سے اثرات کا جائزہ

ایک انسانی برادری اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک کا نظریہ، یہ بھی ایک ایسا نظریہ ہے جسے مولانا رومؒ نے دوسرے بہت سے نظریات کے ساتھ تصوف سے حاصل کیا ہے۔ مولانا رومؒ کے نزدیک امن وسلامتی اور محبت ورواداری کے پیغام کو عام کرنا مقدس مذہبی وانسانی فریضہ ہے۔ مولانا رومؒ نے محبت و مساوات کا درس بھی دیا۔ شخصی سلطنتوں کے اثرات طبقاتی تفاوت اور مظالم نے ساری انسانیت کو دکھی بنادیا تھا۔ مولانا رومؒ نے اپنی شاعری سے لوگوں کو انسان کی عظمت اور اس کے مقام کا عرفان بخشا۔ مسلم معاشرے کے مردہ جسم میں روح پھونکنے کے لیے مولانا رومؒ کے نام کا قرعہ نکلا۔ مولانا رومؒ نے اپنی تعلیماتِ امن محبت ورواداری کو عام کیا تو اُسی صدی کے آخر میں حالات نے پلٹا کھایا اور آلِ خان کے سلسلے کے کئی حکمران عیسائیت سے آنکھ مچولی کھلتے رہے تھے۔ لیکن ساتویں حکمران نے بالآخر سرکاری مذہب کے طور پر اسلام قبول کر لیا، اور یہ دین محمدی کی نہایت تابندہ فتح تھی اور اس فتح کے لیے مولانا رومؒ نے بلاشبہ بہت نمایاں خدمات انجام دیں۔ اسی طرح مولانا رومؒ نے اپنی تعلیمات محبت ورواداری کو جس طرح عام کیا، اور اس وقت کا سلطان بھی آپ سے بے حد متاثر تھا۔ اُس کا اس سے بھی ثبوت ملتا ہے کہ سلطانِ وقت علاؤالدین کیقباد[1] آپ کی بڑی تعظیم کرتا تھا۔ اور آپ سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ سلطان نے جب قونیہ کا قلعہ تیار کیا تو ایک روز آپ سے سیر کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا: 'دفع سیل و منع خیل کے لیے اچھا ہے'۔ مگر مظلوموں کی تیر دعا کا کیا علاج آپ نے سوچا ہے۔ جو ہزاروں، لاکھوں برجوں سے گزر جاتی ہے اور عالم خراب کر ڈالتی ہے۔ عدل وانصاف کا قلعہ بنائے کہ اس میں دنیا کا امن اور عافیت کی خیر ہے۔ سلطان پر اس نصیحت کا بڑا اثر ہوا۔ اس کے بعد سلطان نے مظلوموں، غریبوں کے ساتھ حسنِ سلوک کیا اور ان سے محبت سے پیش آتا۔[2] مندرجہ بالا واقعات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ مولانا رومؒ نے معاشرے کی اصلاح کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ کیونکہ اُس وقت سب سے نمایاں کام معاشرے میں امن وسلامتی اور محبت ورواداری کو عام کرنا تھا تاکہ ایک بہترین معاشرہ وجود میں آئے۔

---

[1] علاؤالدین کیقباد سلجوق سلطان روم تھا جس نے 1220ء سے 1237ء تک حکومت کی۔ سلطان علاءالدین کیقباد سلاجقہ روم کا آخری بااثر حکمران تھا۔ مزید تفصیلات کے لیے؛- Najībābādī, Akbar Shāh Khān, *Tārīkh-i Islām*, (Deoband: Maktabah-i-Raḥmat, 1968), 414.

[2] ندوی، سید ابوالحسن علی، **تاریخ دعوت وعزیمت** (لکھنو: کاکوزی آفسیٹ پریس، 2010)، جلد اول، ص 341۔

باب چہارم

بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کی تعلیمات کی عصری معنویت

فصل اول: بابا فریدؒ کی تعلیماتِ امن و رواداری کی عصری اہمیت

فصل دوم: مولانا رومؒ کی تعلیماتِ امن و رواداری کی عصری اہمیت

فصل سوم: بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کی تعلیمات کا تقابل

باب چہارم: بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کی تعلیمات کی عصری معنویت

تمہید:

پاک و ہند میں اسلام صوفیائے کرام کی کوششوں سے پھیلا۔اس خطے میں ان مردانِ باخدا کا وجود اللہ تعالیٰ کا انعام تھا۔ برصغیر میں مسلمان سلاطین نے کم و بیش ایک ہزار سال تک حکومت کی،اس دوران میں ہندوؤں نے اسلام کو ختم کرنے کی بہت کوششیں کیں۔ مگر صوفیا کی مسلسل تبلیغی کوششوں کے سامنے وہ کبھی کامیاب نہ ہو سکے۔

صوفیا کی تعلیمات کو ہم نے نظر انداز کر دیا ہے،اسی وجہ سے ہم ہدایت کے راستوں سے بھٹک رہے ہیں یہ صوفیا کی تعلیمات ہی تو ہیں جنہوں نے ہر دور میں مسلمانوں کی مدد اور راہنمائی کی ہے۔صوفیا کرام نے صبر،شکر،خدمتِ خلق،امن و محبت اور رواداری کی مثالیں قائم کیں۔ بزرگانِ دین نے نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کے مطابق انسانیت کی اصلاح اور فلاح کی شمع روشن کی۔دورِ انسانیت میں بہت کم ایسی ہستیاں ہیں جو انسانوں کی سربلندی کے لیے اپنی صدائے حق،محبت،سچ وعدوں اور کامل راہنمائی کی وجہ سے صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی ہمارے دلوں میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے کرداروں کو ہم سے کوئی نہ تو جدا کر سکتا ہے،اور نہ اُن کے خیالات اور تعلیمات کو ہم سے کوئی چھین سکتا ہے۔اُن کے عمل سے بھرپور تجربات،روحانی پیغامات،اور اُن کی وہ تعلیمات جس سے معاشرے میں امن و محبت کی فضا قائم ہو اور ہر شخص رواداری کا مظاہرہ کرے،یہ سب ہمارے جدید اور گوناں گوں سماجی مسائل کا بہترین حل پیش کرتے ہیں۔مولانا رومؒ کی تعلیمات کا بنیادی مقصد معاشرے میں امن اور رواداری کو فروغ دینا ہے،اور معاشرے میں انسانی اقدار کو عام کرنا اور ہمیں معاشرتی برابری کے حصول کے لیے مولانا رومؒ کی تعلیمات کی طرف لوٹنا ہو گا۔مولانا رومؒ نے صدیوں قبل موجودہ حالات کا اندازہ کر لیا تھا۔دنیا میں افراتفری اور جنگوں کا ماحول آپ کی تعلیمات کی ہی بدولت ختم ہو گا۔مولانا رومؒ نے اپنی ساری زندگی لوگوں کی اصلاح اور دین کی اشاعت میں گزاری اور عین نبی کریم ﷺ کے بتائے ہوئے طریقوں اور قرآن مجید کی تعلیمات کے مطابق دین کی تبلیغ کی۔

فصل اول: بابا فریدؒ کی تعلیماتِ امن و رواداری کی عصری معنویت

صوفیا کرام اور مشائخ عظام نے اپنے صوفیانہ کلام و تعلیمات سے نہ صرف اپنی زندگی میں لوگوں کی رہنمائی کی بلکہ اپنے وصال کے بعد پیچھے چھوڑے ہوئے علمی و فکری ورثہ کی صورت میں ملتِ اسلامیہ کی ہدایت کا ذریعہ ہے۔ صوفیا کا پیغام امن و محبت، برداشت، بھائی چارے اور رواداری سے عبارت ہے۔ اور ان کی فیوض و برکات کا سلسلہ دورِ حاضر میں بھی جاری و ساری ہے۔ آج کا معاشرہ یہ ہے کہ انسان کے ضمیر کی آواز مشینوں کی گڑگڑاہٹ میں گم ہو گئی ہے۔ روپے کی افراط، مشینوں کی حکمرانی، مہلک ہتھیاروں کا پھیلاؤ، مختلف فلسفوں اور عقیدوں کا ٹکراؤ، بات بات پر قتل اور انسانیت ایک برائے نام چیز رہ گئی ہے۔ ایک عقیدہ کھلتا ہے تو دس نئے عقیدے سامنے آجاتے ہیں۔ مذہب رسوم اور نئے نئے تجربات کا شکار ہو گیا ہے۔ لیکن ان سب میں ایک آواز ایسی ہے جس کو سننے کے بعد ان سب مسائل کا حل نظر آتا ہے، اور وہ ہے امن و محبت، رواداری، اور بھائی چارے کے داعی و مبلغ بابا فرید الدین گنج شکرؒ ہیں جنہوں نے اپنی تعلیمات میں امن، سلامتی، محبت، بھائی چارہ اور رواداری کے عنصر کو نمایاں کیا، تاکہ لوگ اس سے مستفید ہو سکے اور معاشرے کے ایک امن پسند شہری بن سکے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بابا فریدؒ کی تعلیمات کا مطالعہ کر کے اس سے دوسروں کو آگاہ کریں۔ تاکہ ہم میں ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا مادہ پیدا ہو اور ہمارا معاشرہ امن و محبت کا گہوارہ بن سکے۔[1]

ہمارے ملک میں سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے رواداری کا پہلو۔ ہم ایک دوسرے کو دین کی بحث میں قتل کرنے تک کو جائز قرار دیتے ہیں، یا ہم کسی غیر مذہب یا کسی دوسرے عقیدے سے تعلق رکھنے والے کی دل آزاری کے سمجھتے ہیں کہ ہم نے ایک سچا اور پکا مسلمان ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ طریقہ کار بالکل غلط ہے ہمیں کسی کے مذہب یا عقیدے کے بارے میں کچھ کہنے کا حق نہیں ہے یہ اُس کا اور اللہ کا معاملہ ہے۔ ہم یہ سب اس لیے کرتے ہیں کہ ہمیں اپنے ہی دین کے متعلق آگاہی نہیں ہے اور یہ صرف اسی طرح ممکن ہے جب ہم بابا فریدؒ کی تعلیمات کا بغور مطالعہ کریں گے اور سمجھیں گے۔ جو بات بابا فرید الدین گنج شکرؒ نے اشعار کے ذریعے بتائی وہ بات نبی کریم ﷺ نے قرآن و احادیث کی شکل میں ہم تک پہنچا ہی ہے۔

---

[1] نظامی، **تاریخ مشائخ چشت**، جلد 1، ص 335۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی تعلیماتِ امن و محبت اور رواداری کو پڑھیں اور اس کو اپنے معاشرے میں عام کریں۔اس کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں کہ سیمینار منعقد کیے جائے یا پمفلٹ وغیرہ کے ذریعے لوگوں میں ان تعلیمات کو عام کیا جائے ،تاکہ ہمارا معاشرہ امن و محبت اور سلامتی کا گہوارہ بن جائے۔امن و سلامتی کا تصور اسلام میں ایک بنیادی اور گہرا تصور ہے۔یہ تصور اسلام کے مزاج سے گہری وابستگی رکھتا ہے۔اسلام کا پورا نظام حیات،اس کے قوانین وضوابط اس کے احکام ونواہی اور رسوم سب اس تصور کے ساتھ جڑے ہیں۔

مذہبی منافرت کا خاتمہ ومذہبی رواداری

اسلام نے انسانیت کو 'لا اکرہ فی الدین' کہہ کر مذہبی آزادی عطا کی ہے۔امن وامان کو ختم کرنے والے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ ایک دوسرے سے بے بنیاد باتوں پر نفرت کرتے ہیں۔نبی کریم ﷺ نے بھی قیامِ امن کے لیے ایسے ہی اقدام کیے تھے، کیونکہ ظہورِ اسلام کے وقت امن وامان کو ختم کرنے والے اسباب میں سے ایک اہم سبب یہ تھا۔اسلام کے خلاف عربوں کا اٹھ کھڑے ہونا اور اسلام کا صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے کی جانے والی کوششیں اس حقیقت کی دلیل ہیں، کہ آپ ﷺ نے جس دین کی دعوت دی وہ تمام مذہبی منافرتوں سے پاک ہے۔

((قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السِّلاَحَ فَلَيْسَ مِنَّا))[1]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ ہے:''جو ہم مسلمانوں پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اسی طرح بابا فریدؒ نے نبی ﷺ کی تعلیمات کو مشعل راہ بنا کر لوگوں کو ایک بار پھر سے محبت کا پیغام دیا۔اور اب ایک بار پھر سے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم بابا فریدؒ کی تعلیمات کو عام کریں اور معاشرے میں امن اور محبت، بھائی چارہ اور مذہبی رواداری کو فروغ دے۔

فریدا من میدان کر ٹوٹے بٹے ڈھاہ　　اگے مول نہ آوسی دوجک سندی بھاہ۔[2]

ترجمہ: اے فریدا! اپنے دل کو صاف وہموار کر اور راستے میں آنے والے تمام گڑھوں کو مسمار کر دے۔ایسا کرنے سے تو دوزخ کی آگ میں نہ جلے گا۔

---

[1] بخاری،**الجامع الصحیح**، کِتَاب الْفِتَنِ،ح7074۔

[2] . Guru Granth Sahib, (S. Gurbachan Singh Bedi), 5895

اس شعر میں بابا فریدؒ نے اپنے دل کو صاف کرنے کی تلقین کی ہے اور کہا ہے کہ اگر تو اپنا دل پاک صاف کر لے گا تو پھر تیرے دل سے ہر ایک بیماری جو تو نے ہر ایک کے لیے رکھی ہے صاف ہو گئی تو تیرا دل سکون میں آئے گا اور تو دوسروں کو بھی پھر سکون دینے کا موجب بنے گا۔ اور اس طرح یہ معاشرہ بھی امن و سکون کا گہوارا بن جائے گا۔ عصرِ حاضر میں اسی بات کی سب سے زیادہ ضرورت ہے کہ ہم اپنا دل دوسروں کے لیے صاف کر دے اور رواداری کا مظاہرہ کریں تا کہ معاشرے سے فساد و نفرت ختم ہو اور اس کی جگہ امن و محبت اور رواداری کو فروغ مل سکے۔

اخوت و محبت کا فروغ

جس معاشرے میں باہمی اخوت و بھائی چارہ کی فضا قائم ہو۔ وہاں عمومی مزاج صلح و آشتی کا ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون و ہمدردی، اخلاص و ایثار کے جذبات رواج پاتے ہیں۔ نبی ﷺ نے بھی ایک پُرامن معاشرے کے قیام کے لیے ہجرت کے فوراً بعد مواخات کا رشتہ قائم کر کے وہاں کے لوگوں کے درمیان محبت اور بھائی چارے کو فروغ دیا۔ جس سے معاشرے میں امن کو تقویت ملی، اُن کے اندر ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا مادہ پیدا ہوا۔

بابا فریدؒ نے اپنے اشعار کے اندر بھی اسی طرح کی تعلیمات کو جگہ دی جس سے معاشرے کے اندر اخوت و محبت اور بھائی چارے جیسی اہم خوبیوں نے جنم لیا۔ ابھی ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے معاشرے کے اندر دوبارہ ایسی ہی تعلیمات کو لائیں جس سے معاشرہ امن و محبت اور اخوت کا گہوارا بن جائے۔ بابا فریدؒ نے جس چیز کی تعلیم دی، اس کی موجودہ دور میں اشد ضرورت ہے۔ ہمارے اندر سے برداشت ختم ہو چکی ہے ہم ایک دوسرے پر فوراً غصہ ہو جاتے ہیں اس کی بات کو نہ سنا جاتا ہے اور نہ برداشت کیا جاتا ہے۔ اسی بات کو بابا فریدؒ ایک خوبصورت شعر میں بیان کر رہے ہیں۔

فریدا بُرے دا بھلا کر غصہ من نہ ہنڈھائے　　　　دیہی روگ نہ لگی پلے سمجھ کچھ پائے۔[1]

ترجمہ: اے فرید! تو بد انسان سے بھی نیکی کا برتاؤ کر۔ اس کے لیے دل میں کسی قسم کا کینہ اور بغض نہیں رکھنا چاہیے۔ اگر تو اس طرح کرے گا، تو تُو کسی مرض میں مرض میں مبتلا نہیں ہو گا اور ہمیشہ خوش رہیے گا اور اپنے حصول کو پائے گا۔

---

[1]. ibid, 5896.

باباؒ فریدؒ نے جو پیغام اس شعر میں دیا ہے وہ آج ہماری ضرورت ہے ، کہ ہم ہر ایک سے محبت سے پیش آئیں۔اپنے دل میں سے دوسروں کے لیے کینہ کو ختم کر کے محبت کو جگہ دے تاکہ یہ معاشرہ محبت وامن اوراخوت کی بہترین مثال بن سکے۔

فرقہ واریت کا خاتمہ

عصرِ حاضر میں داخلی امن واستحکام کے لیے فرقہ واریت کا خاتمہ ناگزیر ہے۔ مسلمانوں کی آپس کی تفرقہ بازی کا فائدہ غیر مسلم اُٹھارہے ہیں اور خود مسلمان کو مسلمان کے ہاتھ ہی سے قتل کیاجارہاہے۔فرقہ دوسروں کے ہاتھ مضبوط کرنے کا باعث بنی ہوئی ہے۔ یہ صورت حال ملک کی سلامتی کے لیے بہت بڑاخطرہ ہے۔اسلام تو ہر طرح کی گروہ بندیاں مٹانے اور ایک دوسرے کو ملانے کے لیے آیا تھا۔علماء کرام اگرخلوص نیت سے ان گروہ بندیوں کا خاتمہ کرناچاہیں تو کر سکتے ہیں،اوراس کے لیے انھیں اپنے ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر ملی اور قومی مفاد کے لیے سوچناہو گا۔ بابافریدؒ کی تعلیمات موجودہ دور میں ہمارے لیے آبِ حیات کی مانند ہیں۔ہم ان سے مستفید ہو کے اپنی اور دوسروں کی زندگی بچا سکتے ہیں۔ہم ایک معاشرے میں ہم مذہب ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ بابا فریدؒ نے اپنے اشلوک کے ذریعے فرقہ واریت کو ختم کرنے کا راستہ دکھایاہے۔یہ وقت کی ضرورت ہے کہ ہم بابافریدؒ جیسے صوفیاجو کہ امن ومحبت کے داعی اور معاشرے سے عدم رواداری کا خاتمہ کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں،اُن کی تعلیمات کا پرچار کریں۔

سبھان من مانک، ٹھاہن مول مچانگوا　　　　جے توپریادی سک ہیاؤنہ ٹھاہیں کہیں دا۔[1]

ترجمہ:سب کادل موتی ہوتاہے اسکاتوڑنااچھانہیں۔اگرتو محبوب سے ملنے کی خواہش رکھتاہے تو کسی کادل نہ توڑ۔

اس اشعار میں بابافریدؒ نے سب کے دلوں کو جوڑنے اور ددل سے محبت کرنے کی تلقین کی ہے۔اور اُن کا کہنا ہے کہ اگرتو سب کے ساتھ محبت کے ساتھ پیش آئے گا تو تجھے اللہ کا دیدار اور قرب بھی حاصل ہو گا اور یہ دنیا جنت کا منظر پیش کرے گی۔موجودہ وقت کا تقاضا ہے کہ ہم صوفیاکی تعلیمات کو مدِ نظر رکھ کر اپنی زندگی گزاریں یہ فرقہ واریت غیر مذہب اور غیر ملک لوگوں کا ایک پروپوگنڈا ہے جس کا ہم شکار ہیں۔ہمیں ہمارے ہی ہم مذہب بھائیوں

---

[1] . ibid, 5908.

کے ساتھ جنگ کرنے پر لگا دیا گیا ہے اور ہماری بھی عقل ماؤف ہو گئی ہے جو ہم اپنے دینی بھائیوں سے فرقوں کی وجہ سے جھگڑ رہے ہیں۔ اگر ہم ان تعلیمات پر عمل پیرا ہو جائیں تو سب بیرونی قوتوں کے ناپاک ارادے خاک میں مل جائے اور یہ معاشرہ امن و محبت اور رواداری کا بہتر ماحول فراہم کرے گا۔

رواداری اور برداشت کا فروغ

رواداری کا مطلب ہے ہر نوع کے نسلی، لسانی، علاقائی اور مذہبی امتیازات واختلافات کو ان کا جائز مقام دینا اور برداشت کرنا، یعنی کوئی گورا اس لئے کسی کالے کے پیچھے نہ پڑ جائے کہ چونکہ وہ خود گورا ہے اور کالے کو جینے کا حق کیوں دے؟ کوئی عربی بولنے والا کسی دوسری زبان بولنے والے کی گردن ناپنا شروع نہ کر دے، کوئی ایرانی کسی افغانی کے لیے محض علاقائی اختلاف کے جرم کی پاداش میں خون ارازنی کا فتویٰ صادر نہ کر دے اور ایک مذہب کا پیروکار دوسرے کے لیے غیر مہذب اور موجب آزار نہ بن جائے۔[1]

قیام امن کے لیے رواداری اور برداشت وہ بنیادی نکات ہیں۔ جن کے بغیر امن کا خواب کبھی بھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ مکہ و مدینہ اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ آپ ﷺ کا حسن سلوک و رواداری اس کا روشن ثبوت ہے۔ نبی ﷺ نے اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی رواداری کا مظاہرہ کیا، اور لوگ آپ ﷺ کے اس طرزِ عمل سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ بابا فریدؒ نے بھی آپ ﷺ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کیا، اور انہیں اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کیا۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے معاشرے میں رواداری کو فروغ دینے کے لیے صوفیا کی تعلیمات کو پڑھیں اور ان کو عام کریں۔ اس سلسلے میں بابا فریدؒ کا پیغام بہت اہمیت کا حامل ہے۔

فریدا جو تیں مارن مکیاں تناں نہ مارے   آنپڑے گھر جائیے پیر تنادے چم۔[2]

ترجمہ: اے فریدؒ! جو تجھے زدو کوب کرنا چاہتے ہیں یعنی جو تجھے تکلیف دینا چاہتے ہیں، تو ان سے انتقام نہ لے بلکہ ان کے درِ دولت پر جا کر ان کی قدم بوسی کر یہ حلم وانکساری کی انتہا ہے۔

[1] سیدہ سعدیہ، ''قیام امن اور حیاتِ نبوی ﷺ''، ص 98۔

[2]. ibid, 5881.

بابا فریدؒ اپنے اس اشعار میں برداشت کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں کہ اگر تجھے کوئی مار بھی دیتا ہے تو اس کو بھی برداشت کرو اور اگر کوئی بُرا کہہ دے تو اس کو بھی برداشت کر اور اپنے اندر انکساری لاتا کہ دوسرے اس سے متاثر ہوں اور وہ تجھ جیسا بنے اور ہر بندہ برداشت کرنے کی صلاحیت اپنا سکے۔ آج کل ہمیں اس چیز کی اشد ضرورت ہے کہ ہم دوسروں کی بات کو برداشت کریں۔ تاکہ فتنہ و فساد کو پھیلانے سے روکا جا سکے۔ جس معاشرے میں رواداری اور برداشت نہ ہو وہاں امن و محبت کا قیام ممکن نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہمیں پہلے رواداری کو معاشرے میں عام کرنا ہو گا تاکہ امن و محبت قائم ہو سکے۔

اسلام امن و سلامتی، محبت، بھائی چارے اور رواداری کا مذہب ہے، اسی طرح دنیا والوں تک اسلام کا پیغام پہنچانے والے حضرت محمد ﷺ دونوں جہانوں کے لیے رحمت ہیں۔ یہی وہ پیغام ہے جس کو صوفیا کرام نے بھی لوگوں میں عام کیا، اس سلسلے میں جو کچھ صوفیا نے لوگوں کو کہا اور جس طرح انہوں نے زندگی بسر کی وہ سب انہوں نے نبی ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کار پر ہے۔ جن کا یہ کہنا ہے کہ صوفیا نے جو تبلیغ کی وہ اُن کی اپنی طرف سے ہے، وہ سب اسلام اور اسلام کے مبلغ صوفیا کے خلاف سازش ہے۔ ہمارے صوفیا اکرم نے دین و دنیا میں بھی مقام حاصل کیا ہے۔ جس کی وجہ سے مختلف مذاہب کے ماننے والے ان کا احترام کرتے ہیں۔ ان سے محبت کرتے ہیں، اور ان کی تعلیمات کو پڑھ کر اُس پر عمل کرتے ہیں، جو کہ نبی ﷺ کی تعلیمات کا حاصل ہیں۔ بہر حال اسلام ایک ایسا دین ہے، جس میں ایک دشمن کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔ ہر ایک کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا، اور امن و محبت، بھائی چارے اور رواداری کا حکم دیا جس کو صوفیا نے اپنی تعلیمات میں سرِ فہرست رکھا۔ جن صوفیا نے اس کام کو بخوبی انجام دیا اُن میں ایک نام بابا فرید الدین گنج شکرؒ کا بھی ہے۔ بابا فریدؒ کا دور کوئی کم پُر آشوب دور نہ تھا۔ جس میں ایک مثالی انسان کی طرح زندگی گزارتے ہوئے، انہوں نے اپنے افکار و اعمال کے ذریعے آدمی کو انسان بنانے کی سعی کی، اُسے حسنِ عمل، صبر و تحمل، محبت و رواداری، روشن خیالی، انسان دوستی اور انسانیت کا درس دیا۔ آج کا دور نہایت ترقی یافتہ ہونے کے باوجود بابا فریدؒ کے دور سے کہیں زیادہ پُر آشوب دور ہے۔ جس میں قومی، نسلی اور مذہبی منافرتوں کا بازار گرم ہے۔ جنگ و جدل اور دہشت گردی کے بھیانک سائے ساری دنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔[1]

[1] محمد ممتاز، "**بابا فرید گنج شکرؒ کی شاعری کا سماجی مطالعہ**"، (بہاول پور: اسلامیہ یونیورسٹی، 2020)، ص44۔

ایسی صورت حال میں بابا فریدؒ کے افکار اور تعلیمات کی معنویت اہمیت اور ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔

یہ جس دور میں ہم رہ رہے ہیں۔ یہ نہایت ترقی یافتہ دور بن چکا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی آسمان کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں۔اس دور کا انسان مادی سطح پر خوشحالی کی نئی جہتیں چھوتے ہوئے اپنی کامیابیوں پر خوش ہے۔ان کامیابیوں کے ساتھ ساتھ اس انسان کو سماجی، روحانی اور اخلاقی قدروں کے انتشار کا شدید سامنا ہے۔ یہ انتشار آہستہ آہستہ اب ایک بحران کی شکال میں آچکا ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں بڑھتی ہوئی غارت گری، بین المذہبی اور بین الثقافتی ٹکراؤ، مذہبی شدت پسندی اور عدم رواداری سے پیدا ہونے والی نفرت امنِ عالم کے لیے نئے خطرات کی شکل میں سامنے آرہے ہیں۔

بابا فریدؒ کی ذات کے کئی رنگ ہیں۔ کبھی وہ مذہبی پیشوا کی حیثیت سے رواداری، امن و محبت اور اصلاح کا فریضہ انجام دیتے نظر آتے ہیں،اور کبھی انسانیت کے علمبردار کے طور پر سامنے نظر آتے ہیں۔ صوفیوں اور فقیروں کی بات تو آج بھی ہوتی ہے۔ لیکن آج ہم اپنے ارد گرد ذات پات اور معیشت کی روز بروز اونچی ہوتی ہوئی دیواریں دیکھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے انسان،انسان کا دشمن بن گیا ہے۔انسانیت برائے نام سی رہ گئی ہے۔لوگوں میں برداشت کی کمی ہے،ایک دوسرے سے محبت ختم ہو گئی ہے۔ دین کے نام پر ایک دوسرے کا قتل تک کر دیتے ہیں حالانکہ جس دین کے نام پر لوگ ایک دوسرے کا قتلِ عام کرتے ہیں وہی دین اِن کو رواداری اور امن و محبت کا پیغام دیتا ہے،اور کسی کو کسی پر اپنا دین یا عقیدہ مسلط کرنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ یہ حکم دیتا ہے کہ کسی پر کوئی جبر نہیں وہ جو چاہے اپنے لیے راستہ اختیار، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سب کچھ کھول کو بیان کر دیا ہے اب ہر ایک کی مرضی ہے وہ جو چاہے راستہ اختیار کرے۔ لیکن ہمیں ہر صورت ایک دوسرے کے ساتھ امن و محبت اور رواداری کا مظاہرہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔یقیناً اس صورت حال کو بدلنے میں بابا فریدؒ کے پیغام جو کہ انسان کو انسان کے ساتھ جوڑنے کے لیے ایک پُل کا کام کرتا ہے، زندگی کی اشد ضرورت ہے۔ آج ہمیں بابا فریدؒ کے اشلوک کو پڑھنے اور سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔[1]

---

[1] سنگھ، **بابا فرید دے اشلوک**، ص56۔

بابا فریدؒ کی تعلیمات میں نہ صرف اللہ کی وحدانیت کو بیان کیا ہے بلکہ یہ بھی کیا ہے کہ اُس کی ذات برحق ہے۔ اور یہ کہ انسان کی زندگی مختصر ہے، اور اس چھوٹی سی زندگی میں اُسے اندھیرے سے اُجالے کی طرف ایک لمبا سفر طے کرنا ہے، اور نفرت، ظلم و جبر کی اس دنیا کی جگہ، ایک نئی دنیا تعمیر کرنی ہے۔ جہاں محبت اور صرف محبت ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بابا فریدؒ آج بھی روشنی کا ایسا مینار ہیں جس سے روشنی حاصل کر کے یکجہتی، انسانی اخوت، امن و محبت اور رواداری کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔۔ کیونکہ ہم سب اس بات کو جانتے ہیں کہ انسانی رشتوں کی عظمت ہی کی بنیاد ہے جس سے ایک خوبصورت معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ بابا فریدؒ کی تعلیمات کو ہر اس جگہ پہنچایا جائے۔ جہاں انسانی آبادیاں ہیں۔ بابا فریدؒ کی شخصیت محبت امن اور رواداری کی علامت ہے۔ جس پر ملک کی بنیاد رکھی ہوئی ہے۔ اگر یہ بنیاد کمزور ہو گئی تو ملک کمزور ہو گا، اور اگر اس بنیاد کو طاقت ملے گی تو ملک کی قومی ایکتا اور بھائی چارے کو فروغ ملے گا۔ جس پر چل کر ہم ایک پُرامن اور رواداری پر مشتمل معاشرہ قائم کر سکتے ہیں۔ بابا فریدؒ جن کے پیغام اور تعلیمات میں ہماری زندگی کی مشکلات کا حل نظر آتا ہے۔ انہوں نے ایک ایسے معاشرے میں جنم لیا جو کثیر المذہب، کثیر القومی، کثیر السانی اور توہمات کی زد میں تھا۔ انسانی زندگی کی کوئی وقعت نہ تھی۔ ان حالات میں بابا فریدؒ نے اعلیٰ مقاصد کی تعلیم دی۔ رواداری کا کلچر پیدا کیا۔ علم و حکمت کی طرف لوگوں کو مائل کیا۔ اپنے ملک سے پیار کرنے اور امن و محبت کے ساتھ زندگی گزارنے کا درس دیا۔[1]

بابا فریدؒ برصغیر کی ان چند بزرگ ہستیوں میں سے ہیں۔ جنہوں نے رواداری اور انسان دوستی کا پیغام دیا۔ جس زمانے میں بابا فریدؒ نے آنکھ کھولی اُس وقت ہر طرف فتنہ فساد تھا۔ لوگوں میں عدم برداشت کا پہلو نمایاں تھا۔ بابا فریدؒ نے اپنے اشلوک کے ذریعے لوگوں کے رویوں کو بدلا۔ آج بھی اسی چیز کی ضرورت ہے کہ لوگوں کے رویوں میں تبدیلی لائی جائے۔ بابا فریدؒ نے جس طرح بغیر کسی تفریق کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کا پرچار کیا۔ ہمیں بھی کسی کو اپنی ذاتی تنقید کا نشانہ نہیں بنانا چاہیے اور قرآن و احادیث کی بات کو آگے پھیلانا چاہیے۔

[1] فاروقی، نثار احمد، **چشتی تعلیمات اور عصرِ حاضر میں اُن کی معنویت**، ص 48۔

جس طرح بابا فریدؒ نے اپنے ایک اشلوک میں بیان کیا کہ لوگ چاہیے تمہیں بُرا بھلا کہے مگر تُو کسی کو کچھ نہ کہنا، ہمیں اس بات سے سبق حاصل کرنا چاہیے کہ اگر ایک بندہ بُرا بول رہا ہو یا آپ کے ساتھ بُرا سلوک کر رہا ہو تو اُس کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اور بس اچھی بات کی تبلیغ کرو۔

آج ہمیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اسلام کے معانی کو سمجھتے ہوئے امن و محبت اور رواداری کو عام کریں۔ ہمارے ملک میں اقلیتیں بھی آباد ہیں اس لیے ہم اُن کو ہمیشہ عزت دے اُن کی دل آزاری نہ کرے، اُن کو دین کے مسئلے میں اُن پر کسی قسم کی کوئی سختی یا اُن پر کسی قسم کی پابندی نہ لگائے۔ اُن کی مذہبی رسوم ادا کرنے میں اُن کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ دے، ہاں مگر جو حدود و قیود اسلام میں متعین ہیں اُن کو اُس پر عمل ضرور کرنا ہو گا۔

جس طرح بابا فریدؒ نے اپنی خانقاہ کا دروازہ ہر عام و خاص کے لیے کھول رکھا تھا۔ اسی طرح ہمیں بھی اپنے دل کے دروازے ہر ایک کے لیے کھول کو رکھنے ہیں اور اگر کوئی مذہب یا فرقے والا ہمیں پسند نہ ہو پھر بھی ہمیں اپنی ذاتی رائے کو اس شخص کے سامنے پیش کیے بغیر اُس سے بات کرنا ہو گی، اور یہ ہی طرز عمل اسلام میں اپنایا گیا ہے۔

عصرِ حاضر میں رواداری کے پہلو کو نمایاں کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ کچھ ممالک ایسے ہیں جو مذہب کے نام پر قتلِ عام کرتے ہیں۔ ان میں سر فہرست کشمیر اور فلسطین ہیں۔ جو صرف اور صرف وہاں کے لوگوں کو اس لیے قتل کر رہے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ حالانکہ اس کے بر عکس ہمارے ملک میں جو اقلیتیں ہیں اُن کو اُن کے حقوق پورے ملتے ہیں۔ جس طرح بابا گرونانک کی 550 ویں سالگرہ پر کرتار پور راہداری کھول کر پاکستان نے رواداری کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ آج پاکستان کو دہشت گردی، انتہا پسندی اور فرقہ واریت جیسے چیلنجز کا سامنا ہے۔ بابا فریدؒ نے اسلام کا جو حقیقی تصور دنیا کے سامنے اپنی شاعری کی صورت میں پیش کیا ہے اور ذاتی اخلاق و کردار سے لوگوں کو دلوں کو مسخر کر کے اسلام کی ترویج و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اب ہمیں کرنا یہ ہے کہ ان کی تعلیمات کو عام کر کے استفادہ حاصل کرنا ہے۔[1]

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات سامنے آتی ہے، کہ ہمارے جو صوفیا امن و محبت اور رواداری کے داعی بن کر آئے ہیں۔ ہمیں اُن کی تعلیمات کو پڑھنے اور اُن پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ معاشرے میں امن، محبت اور رواداری کو بہتر طور پر پھیلایا اُن جا سکے۔ ہمارے مذہب کی بنیادی تعلیمات توحید کے بعد اگر کسی چیز پر سب سے زیادہ

---

[1] محمد ممتاز، "**بابا فرید گنج شکرؒ کی شاعری کا سماجی مطالعہ**" ص 56۔

زور دیا گیا ہے تو وہ دوسروں کے ساتھ بہتر سلوک پر دیا گیا ہے۔ نبی ﷺ نے بھی اپنے دشمنوں کے دل اپنے حسنِ سلوک کی وجہ سے جیت لیے۔ اور وہی لوگ اسلام کے دائرے میں خوشی خوشی داخل ہوئے۔ اگر ہم ان کی تعلیمات سے استفادہ کر کے تو اپنی ذات تک ہی اس پر عمل کر لے تو کافی حد تک ہم اس معاشرے میں امن و محبت اور رواداری کا ماحول پیدا کر سکتے ہیں۔ جب ہم اپنے دوستوں یا گلی محلے میں لوگوں سے کسی بھی موضوع پر گفتگو کرتے ہیں تو اُن کو صبر و تحمل سے سنیں، اختلاف کرنے کا حق اس دنیا میں ہر شخص کو حاصل ہے، آپ بھی اُس شخص کی باتوں سے اختلاف کر سکتے ہیں مگر اُس سے جھگڑا کر کے ہم ماحول کو نہ ہی خراب کرنے کا حق رکھتے ہیں اور نہ ہی اسلام کی تعلیمات کے برعکس جا سکتے ہیں۔ بابا فریدؒ نے بھی ایسا ہی کیا، کیونکہ نبی ﷺ نے یہ ہی طرزِ عمل اپنایا تھا۔ جب آپ ﷺ اسلام کی تبلیغ کرتے تو صرف امن کا گہوارہ بن کے اگر کوئی بھی آپ ﷺ کو کوئی تکلیف دیتا یا آپ ﷺ کو بُرا بھلا کہتا تو آپ ﷺ اس کو معاف کر دیتے اور اللہ کا پیغام اُس شخص تک پہنچا کر خاموشی اختیار کر لیتے، اُس پر یہ تعلیمات مسلط ہر گز نہ کرتے۔ کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے کہ دین کے معاملے میں کسی پر کوئی جبر نہیں ہے۔ اگر ہم رواداری کے پہلو کو مضبوطی سے تھام لیے تو معاشرے میں امن و محبت خود بخود قائم ہو جائے گی۔ اسلام سمیت دنیا کا کوئی مذہب انتہا پسندی و شدت کا درس نہیں دیتا، اسلام امن و محبت اور رواداری کا پیغام دیتا ہے۔ یہی پیغام بابا فریدؒ نے آج سے بہت سال پہلے دے کر جس طرح لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کیا اور وہ لوگ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ بابا فریدؒ نے نبی ﷺ کے طرز کو اپنایا اور ہمیں اب غیر مسلموں کے سامنے بابا فریدؒ کی تعلیمات کو رکھ کر اسلام کی طرف راغب کرنا ہو گا۔ تاکہ اگر وہ اسلام کی طرف راغب نہ بھی ہو تو کم از کم اسلام کی تعلیمات کو جان تو لے کہ اسلام دینِ امن ہے جس میں رواداری کا عنصر نمایاں ہے۔ اُمتِ مسلمہ اور پوری انسانیت کو محبت احترام اور برداشت کے کلچر کی ضرورت ہے۔ مثبت رویے عام ہوں گے تو امن و سلامتی حاصل ہو جائے گی۔

فصل دوم: مولانا رومؒ کی تعلیماتِ امن و رواداری کی عصری معنویت

اس حقیقت کو مانتے ہوئے کہ وہ صدیوں پہلے اس دنیا سے چلے گئے مگر وہ آج بھی ہمارے درمیان ہماری رہنمائی کے لیے موجود ہیں۔ مولانا رومؒ وہ ہستی ہیں، جن کے الفاظ انسانیت کے لیے منارہ نور ہیں۔ انسانیت سے محبت کرنے والی شخصیات میں مولانا رومؒ اپنی مثال آپ ہیں۔ انہوں نے مردہ دلوں میں آبِ حیات سے زندگی کی روحانی اور اخلاقی کمی کو پورا کیا اور لوگوں میں اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ اگر ہم معاشرے میں امن چاہتے ہیں تو ہمیں اسلام کا دامن مضبوطی سے تھامنا ہوگا۔ اور امن و محبت اور رواداری کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ جس سے معاشرے میں امن بھی ہو گا اور انسانیت بھی قائم و دائم رہے گی۔ مولانا رومؒ کی تعلیمات کا بنیادی مقصد معاشرے میں امن اور رواداری کو فروغ دینا ہے، اور معاشرے میں انسانی اقدار کو عام کرنا اور ہمیں معاشرتی برابری کے حصول کے لیے مولانا رومؒ کی تعلیمات کی طرف لوٹنا ہوگا۔

جن ممالک میں دہشت گردی، انتہا پسندی اور اقلیتیں محفوظ نہ ہو وہاں ترقی نہیں ہوتی، حکومتِ پاکستان ملک کی خوشحالی کے لیے ان چیلنجز سے نمٹنے کے لیے اقدامات کر رہی ہے۔ اس کے لیے ہمیں صوفیا جیسے کہ مولانا رومؒ ان ہستیوں کی تعلیمات کو پڑھنے اور ان کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ جو لوگ پاکستان کے اندر ہیں یا باہر ہیں وہ بھی ان تعلیمات سے مستفید ہو سکے اور ایک پُر امن معاشرے کی بنیاد قائم ہو سکے اور پاکستان میں اقلیتوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہو۔ مولانا رومؒ نے جن حالات میں آنکھ کھولی تھی اُس وقت بھی ایسے ہی مسائل تھے، ہر بندہ دوسرے کو نفرت اور حقارت سے دیکھتا تھا۔ ہر طرف فتنہ و فساد تھا سب سے بڑا فتنہ تو تاتاریوں کے حملے تھے۔ جس کی وجہ سے لوگ ایک پُر امن معاشرے اور آپس میں محبت اور بھائی چارے والی زندگی کو بھول چکے تھے۔ عدم رواداری کا عنصر تو نمایاں تھا۔ اور آج بھی اسی طرح کا کچھ ماحول نظر آتا ہے۔ مذہب کے نام پر قتل و غارت ہے، کوئی بندہ کسی کو برداشت کرنے کی دھن میں نہیں ہے چاہے وہ گھر ہو یا محلہ یا ملکی امور ہو۔ جس کی وجہ سے ہم ایک پُر امن معاشرے کو ترس گئے ہیں۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مولانا رومؒ جیسی ہستیوں جو امن و محبت، سلامتی، بھائی چارے اور رواداری کے مبلغ و داعی ہو، اُن کو مطالعہ کریں اور نوجوان نسل کو ان کی تعلیمات کی طرف راغب کریں۔ تاکہ یہ نوجوان نسل اس کو پڑھ کو اس پر عمل کر کے ایک مضبوط اور امن و محبت اور رواداری پر مشتمل معاشرے کی بنیاد رکھ سکے۔

مولانا رومؒ نے صدیوں قبل موجودہ حالات کا اندازہ کر لیا تھا۔ دنیا میں افراتفری اور جنگوں کا ماحول آپ کی تعلیمات کی ہی بدولت ختم ہو گا۔ مولانا رومؒ نے اپنی ساری زندگی لوگوں کی اصلاح اور دین کی اشاعت میں گزاری اور عین نبی ﷺ کے بتائے ہوئے طریقوں اور قرآن مجید کی تعلیمات کے مطابق دین کی تبلیغ کی۔ مولانا رومؒ کی جو بھی تصنیفات ہیں، اُن میں سے ہر ایک قرآن واحادیث کے مطابق ہیں۔ موجودہ دور کی پیچیدگیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور اپنے موضوع کے اندر رہتے ہوئے، میں نے صرف مولانا رومؒ کی تعلیمات امن و محبت اور رواداری کے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

عشق و محبت

مولانا رومؒ نے عشق اور محبت پر بہت زور دیا۔ مولانا نے عشق و محبت کی بات سب سے زیادہ کی ہے۔ اُن کے نزدیک عشق ایک ایسی قوت ہے۔ جس کے ہوتے ہوے بڑے بڑے کام چند لمحات میں ہو جاتے ہیں۔ مولانا کے نزدیک عشق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عاشق اور محبوب میں شانِ انفرادیت پیدا کرتا ہے۔[1] عصرِ حاضر میں ہماری سب سے اہم ضرورت محبت کو عام کرنا ہے۔ اگر ہمارے دلوں میں محبت کا جذبہ قائم رہے گا تو ہم دوسروں کو برداشت کرنے کی صلاحیت ہمارے اندر زیادہ ہو گی۔ ہمیں ابھی اس چیز کی ضرورت ہے کہ ہم اُن باتوں کو مانیں جو ہمیں اللہ نے قرآن مجید میں بتائی ہیں یہ ہی تعلیمات دورِ حاضر کی ضرورت ہے اور مولانا رومؒ کے اشعار میں واضح طور پر بیان ہیں۔

از محبت سُقم صحت می شود　　وز محبت قہر رحمت می شود[2]

ترجمہ: محبت سے بیماری، تندرستی بن جاتی ہے، محبت سے قہر رحمت بن جاتا ہے۔

مولانا روم نے جو ادھر بیان کیا ہے کہ محبت سے بیماری تندرستی میں بدل جاتی ہے اور محبت سے قہر رحمت میں بدل جاتا ہے۔ اس میں اللہ کی خوشنودی اور اُس کی رحمت کی بات ہو رہی ہے، آج ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اللہ کی رحمت کو حاصل کریں اور یہ اسی طرح ممکن ہے جب ہم اُس کی مخلوق سے محبت کریں گے چاہے ہمیں کوئی پسند ہو یا نہ ہو۔ ہم اپنی ذاتی ترجیحات کی بنا پر کسی سے نفرت نہیں کر سکتے۔ ہمیں ہمارا دین ہر ایک سے پیار و محبت کا درس

---

[1] عبدالطیف خان، **سوز و ساز رومی**، (لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، 2008) ص 76۔

[2] رومی، **مثنوی معنوی**، دفتر دوم، ص 281۔

دیتا ہے چاہیے وہ مسلم ہو یا غیر مسلم ہو اور یہ ہی اسلام کی تعلیمات کا نمایاں پہلو ہے۔ اگر آج ہم اس اُصول پر عمل کریں تو ہمارے معاشرے میں امن و محبت اور سکون کو فروغ ملے گا۔

اصلاحِ نفس

عصرِ حاضر میں درپیش مسائل میں سب سے اہم مسئلہ، جس کی اصلاح کرنے کی ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ہے اور مولانا رومؒ نے اس کو بہت خوبصورت انداز میں اس کی اصلاح کی طرف توجہ فرمائی ہے۔ اگر ہر بندہ پہلے اپنی اصلاح کرے چاہے وہ ذہنی اصلاح ہو یا قلبی تو ہمارا یہ معاشرہ پُر سکون اور پُر امن رہے گا۔ مولانا رومؒ نے جو نقطہ بیان کیا ہے اُس کی اصلاح وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ مولانا رومؒ نے نفس کی اصلاح پر زور دیا کہ اگر ہم اپنے نفس کیااصلاح کر دے گئے اور اُس کو اپنے کنٹرول میں رکھے گئے تو سب کام آسان ہو جائے گئے اور معاشرہ بھی پُر امن ہو جائے گا۔[1]

اگر ہمارا نفس اصلاح پر ہو گا۔ تو ہم کسی دوسرے سے بدلہ لینے کی خواہش نہیں رکھے گئے اور اُس کو معاف کرنے کا جذبہ ہمارے اندر پیدا ہو گا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا بھی پسندیدہ عمل ہے۔ نفس کو قابو میں رکھنے کے سلسلے میں مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

چون سزای این بتِ نفس او نداد　　　　از بت نفسش بتی دیگر بزاد[2]

ترجمہ: چونکہ اس نے اپنے نفس کے بت کو سزا نہ دی تھی۔ اس کے نفس کے بت سے ایک دوسرا بت پیدا ہو گیا۔

مولانا رومؒ نے اس شعر میں کس خوبصورت انداز میں بیان فرمایا ہے کہ اگر ہم اپنی اصلاح وقت پر نہ کریں گئے تو ہمارا نفس ہمیں بربادی کی طرف لے جائے گا۔ یعنی ایک بت سے دوسرے بت کا پیدا ہونا مطلب چھوٹی تباہی سے بڑی تباہی کی طرف جانا۔ جس سے معاشرہ بھی ہلاک اور معاشرے کا امن و سکون اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا جذبہ بھی ہلاک۔ اگر ہم یہ صفت اپنے اندر پیدا کر لے کہ ہم نے اپنے نفس کو کنٹرول میں رکھنا ہے اور اِس کو اُس راہ پر لانا ہے جو راستہ امن و محبت کی طرف جاتا ہے۔ جو کہ وقت اور حالات کا تقاضا بھی ہے تو ہمارا معاشرہ امن و محبت اور رواداری کی ایک بہترین مثال بن جائے گا۔

عدم برداشت

[1] عبد الطیف خان، **سوز و ساز رومی**، ص 293۔

[2] رومی، **مثنوی معنوی**، دفتر اول، ص 62۔

ہمارے معاشرے میں آج کل جو ناسور وبا کی طرح پھیلی ہوئی ایک بیماری ہے۔ جس کی اصلاح کی اولین درجے کی ضرورت ہے وہ عدم برداشت اور غصہ ہے۔ وقت اور حالات ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ہم کسی دوسرے کی بات کو برداشت کرنے کے بجائے اُس پر غصہ کریں اور عدم رواداری کا ثبوت دیں۔ مولانا رومؒ نے اپنی تعلیمات میں صبر کی تلقین مختلف طرح سے کی ہے۔ عصرِ حاضر میں ہمیں اس بات کی توجہ دینی ہو گی، اسلامی تعلیمات ہمیں رواداری کا درس دیتی ہیں۔ جس پر ہمیں عمل کرنا ہو گا اور معاشرے کو امن و محبت کا گہوارہ بنانا ہو گا۔ مولانا رومؒ صبر کرنے کی تلقین یوں کر رہے ہیں

صبر از ایمان بیابد سر کلہ حیث لا صبر فلا ایمان لہ۔[1]

ترجمہ: صبر نے ایمان کا تاج پہنا ہے۔ جس کو صبر نصیب اُس کا ایمان نہیں ہے۔

ہمیں آج کل اشد ضرورت ہے کہ ہم صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دے، کیونکہ صبر ہمارے ایمان کا حصہ ہے ہمیں ہمارا دین بار بار اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ صبر کرو اور غصہ نہ کرو چاہیے وہ زندگی کا کوئی بھی پہلو ہو۔ حتٰی کہ اگر دین کا مسئلہ بھی آجائے تو تب بھی ہمیں رواداری کا مظاہرہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ رواداری کا عنصر بہت نمایاں ہے ہمارے مذہب میں نبی ﷺ نے بھی مذہبی رواداری پر زور دیا اور غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک کا رویہ اپنایا ، جس کی وجہ سے بہت غیر مسلم دائرہ اسلام میں آئے۔

صبر و برداشت

دورِ حاضر میں جہاں ہمیں اپنے معاشرے میں سے اور اپنے آپ کی اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔ وہاں ہمیں خود پر نظر ثانی کی بھی ضرورت ہے۔ وقت کی ضرورت ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی رہنا چاہیے، اُس نے جو بہتر سمجھا ہمارے لیے وہ معاملہ ہمارے ساتھ پیش کیا۔ ہمیں اُس کی عطا پر اُس کا شکر گزار رہنا چاہیے۔ موجودہ دور میں چونکہ نفسا نفسی کا عالم ہے، ہر بندہ بہتر سے بہترین کی تلاش میں ہے۔ اسی چکر میں ہم بھول جاتے ہیں کہ ایک ذات اوپر بھی ہے جو ہم سے زیادہ بہتر تدبیر کرنے والی ہے۔ موجودہ دور میں ہر بندہ دوسرے پر نظر رکھے ہوا ہے کہ اُس کے پاس کیا ہے اور میں کس سے محروم ہوں، جب ہم اللہ کی تقسیم پر راضی ہونے کی بجائے اس طرح کا رویہ اپنائیں گے تو یقینا

---

[1] رومی، **مثنوی معنوی**، دفتر اول، ص62۔

ہم خود بھی بد امنی کا شکار ہو گئے، اللہ بھی ناراض ہو گا، اور ہم معاشرے میں بھی فساد کا باعث بنے گے۔ اسی سلسلے میں مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔ کہ حسد ایک ایسی رذیل ہے۔ جو بہت سے رذائل کا سرچشمہ ہے۔ حسد کا مطلب کسی کی بہتری پر جلنا ہے۔ مزید اس پر مولانا فرماتے ہیں کہ حسد خود انسان کے باطن کا مرض ہے۔ جب حسد کا مرض دل پر اثر کرتا ہے تو حواس، فکر اور عقل وغیرہ یعنی تمام دماغی و قلبی خاندان اس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ تمام طاقتیں بجائے کوئی اچھا عمل کرنے کے حسد کے ماتحت کام کرنے لگتے ہیں۔ مولانا کہتے ہیں خوش نصیب ہے وہ شخص جو حسد سے بچا ہوا ہے۔ انسان کو نفسانی خواہشات کے تابع نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ایسا ہوا تو تُو اللہ کے راستے سے گمراہ ہو جائے گا۔[1]

مولانا نفس کو کنٹرول کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ سے بھی مدد طلب کرتے ہیں۔ اُن کے الفاظ ایک انگریز مصنف نے یوں نقل کیں ہیں۔

Let's ask God to help us to self-control:
For one who lacks it, lacks his grace[2]

ہم خدا سے دعا گو ہیں کہ وہ ہمارے نفس پر کنٹرول کرنے میں ہماری مدد کرے؛ جو اس پر استطاعت نہیں رکھتا وہ خدا کی بخشش اور فضل سے محروم رہتا ہے۔

مولانا رومؒ اسی بات کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

باھویٰ و آرزو کم باش دوست　　　　چون یضلک عن سبیل اللہ اوست۔[3]

ترجمہ: خواہش نفسانی اور آرزو سے دوستی نہ کر۔ کیونکہ وہی ہے جو تجھے اللہ کے راستے سے گمراہ کرتی ہے۔

عصرِ حاضر میں اس بات پر عمل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ کہ ہم اپنے نظریات کو اسلامی تعلیمات جو کہ قرآن و احادیث میں ہیں۔ اُن کے تابع کرنا چاہیں یہی تعلیمات مولانا رومؒ نے کئی صدیاں پہلے اپنے اشعار کے ذریعے لوگوں میں عام کی تھی۔ اب یہ وقت دوبارہ آ گیا ہے کہ ہم ان تعلیمات کو پھر سے معاشرے میں عام کریں۔ اور اس کے ذریعے معاشرے میں امن و محبت اور رواداری کو فروغ دے۔

رنج بدخویاں کشیدن زیر صبر　　　　منفعت دادن بخلقاں ہمچو ابر۔[4]

---

[1]عبدالطیف خان، **سوز و ساز رومی**، ص 392۔

[2]. Helsinki, Camille Kabir., *Rumi*: *Daylight: A Daybook of Spiritual Guidance*, (Boston: Shambhala Publications, 1999), 15.

[3] رومی، **مثنوی معنوی**، 113/1۔

[4]رومی، **مثنوی معنوی**، 1060/6۔

ترجمہ: صبر کے ماتحت بدمزاجوں کی تکلیف برداشت کر، ابر کی طرح لوگوں کو نفع پہنچا۔

مولانا رومؒ نے دورِ حاضر کے مسائل کو اس انداز میں صدیوں پہلے بیان کر دیا تھا۔اب ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم صبر واستقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے، اپنے معاشرے کو پُر سکون بنائے اوراِن صوفیا کی تعلیمات سے بھر پور مستفید ہوں۔ برداشت کا حکم اسلام کی تعلیمات کا ایک نمایاں پہلو ہے۔جس کی ہمیں دورِ حاضر میں ضرورت ہے۔رواداری ایک ایسی چیز ہے جس سے غیر مسلم بھی متاثر ہیں۔ مغرب میں جو اسلام فوبیا ہے، اُس کے تدارک کے لیے مولانا رومؒ کی تعلیمات ایک بہترین سرمایہ ہے۔اور باقاعدہ اس پر لوگوں نے بہت کام کیااور اسلام کی سربلندی کے لیے اس کو استعمال کیا۔

اسلام فوبیا کے خلاف مولانا جلال الدین رومیؒ کی تعلیمات سے مثالیں پیش کی جانی چاہیں۔

قونیا انجمن برائے ترک صوفی موسیقی کے منیجر فخری اوزچاکل کا کہنا ہے۔کہ جلال الدین رومیؒ نے صدیوں قبل موجودہ حالات کا اندازہ کر لیا تھا، دنیا میں افراتفری اور جنگوں کا ماحول آپ کے شہ پاروں کے ذریعے دور ہو گا۔انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کو بُراد کھانے کی مہمیں زور پکڑ چکی ہیں جنہیں قبول کرنا ناممکن ہے، دین اسلام خوف کھانے والا مذہب نہیں ہے، بلکہ یہ امن وامان، صراط مستقیم، رواداری اور بھائی چارے کا پرچار کرتا ہے۔اسلام فوبیا کے خلاف ہمیں جلال الدین رومیؒ کے طرز زندگی اوران کی تعلیمات کی مثالیں پیش کرنی چاہیے۔

فخری اوزچاکل نے بتایا کہ آپ کے پیغامات کی بنیادوں میں قرآن کریم اور سنتِ نبوی کی جھلک نظر آتی ہے۔آپ نے 800 برس قبل عصرِ حاضر کے لیے یہ پیغامات بھیجے ہیں، جن کی روشنی نہ صرف مسلم اُمہ کے لیے ہے بلکہ دنیا بھر کے انسانوں کے لیے ہے۔ ہم ان تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر اس معاشرے میں امن ومحبت اور رواداری کو فروغ حاصل ہو۔[1]

رواداری کی تعلیم

موجودہ حالات میں صوفی ازم کی اہمیت کو برقرار رکھنا، اپنی رواداری کو مثالی بنائے رکھنا ہے۔ کیونکہ اسلامی تاریخ کے ہر دور میں دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ ساتھ نگہداشت کی گئی ہے۔اسلام غیر مسلموں کے ساتھ

[1] فخری اوزچاکل، ''مولانا روم کی تعلیمات کو اسلام فوبیا کے خلاف مثال بنایا جائے'' ترکش ریڈیو، 30-1-2017۔

انصاف اور احترام کے ساتھ برتاؤ کرنے اور خاص طور پر غیر مسلموں کے ساتھ جو مسلمانوں کے ساتھ سکون سے رہتے ہیں۔ مولانا رومؒ کی تعلیمات میں بھی محبت اور رواداری کا پہلو نمایاں ہے اور مولانا رومؒ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے کشادگی اور انکساری ہونی چاہیے۔ وہ عالمانہ خود پسندی کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ اس کے بجائے یہ عظیم بزرگ، اپنے پیروکاروں کو لوگوں کے درمیان مشترکیت تلاش کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ آج کل ہمارے معاشرے میں فرقہ واریت اور تشدد کے نام پر ایسے کڑے چیلنجوں کا سامنا ہے۔ یہ جھگڑے مذہب کی الگ الگ ترجمانی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں مخالف نظریات کو کم ہی قبول اور برداشت کیا جاتا ہے۔ چنانچہ معاشرہ جھگڑوں اور تشدد کا شکار ہو جاتا ہے۔ جس سے معاشرے میں امن و محبت، سلامتی و بھائی چارہ ختم ہو جاتا ہے۔ ایسی صورتحال میں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ایسی تعلیمات کو معاشرے میں پھیلایا جائے جو معاشرے میں امن و سکون اور محبت و رواداری کو فروغ دے۔ اس حوالے سے مولانا رومؒ کی شاعری تشدد اور فرقہ واریت جیسے چیلنجز کے جواب میں اپنی مثال آپ ہے۔[1]

مولانا رومؒ نے اپنے اشعار میں جس بات کی طرف اشارہ کیا کہ محبت کو عام کرو، اسی سے یہ دنیا اور دوسری دینا جنت بنے گی، عصرِ حاضر میں ہمیں اسی بات کو پھیلانے کی ضرورت ہے تاکہ جو لوگ ملک میں دین کے نام پر فساد برپا کرتے ہیں اور عدم رواداری کا مظاہرہ کرتے ہیں اُن لوگوں کو ہم شعور دے سکے اور وہ اصل تعلیماتِ اسلام کی طرف آہیں۔ جب معاشرے میں ان صوفیا کی ایسی تعلیمات کو عام کیا جائے گا تو ہمارا معاشرہ امن و محبت اور رواداری کی اعلیٰ مثال قائم کرے گا۔ آج کے دور میں یہی چیز اپنانے کے ضرورت ہے تاکہ مذہبی اختلافات اور فسادات کو روکا جا سکے۔ مولانا رومؒ نے ہمیشہ امن و محبت کی بات کی، ہم آج اُس کو پڑھ کو اور اُس پر عمل کر کے اس کی فلاح و بہبود اور یکجہتی کی حفاظت کر سکتے ہیں۔

ہمیں تصوف کو عام کرنا ہوگا۔ کیونکہ تصوف ایک نظریہ ہیں ہے بلکہ امن اور محبت کے ساتھ زندگی گزارنے کا ایک طریقہ ہے۔ ایک ایسی سوچ جس نے مختلف نظریات کے درمیان موجود دوریوں کو ختم کرنے اور ایک دوسرے کے بھائی چارہ قائم کرنے اور امن و محبت اور رواداری قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس نظام کو نہ صرف پاکستان میں بلکہ پاکستان سے باہر بھی بہت سراہا گیا ہے۔ مغرب میں مولانا رومؒ کی تعلیمات کو بہت اہمیت دی جا

---

[1] خلیفہ، عبدالحکیم، **تشبیاتِ رومی**، (لاہور، پاکستان: ادارہ ثقافت اسلامیہ، 1909)، ص450۔

رہی ہے۔ مولانا رومؒ کی مثنوی کی ایک حکایت کا شعر ہے جس کا ترجمہ یوں ہے کہا اندھا دھند اللہ کی رسی پر ہاتھ ڈال یعنی بغیر کسی فتنہ اور فساد کے ایک اللہ کے ہو جاؤ اور جو وہ کہہ رہا اس کی بات پر آمین کہو، تاکہ اس زمین میں امن و سکون قائم ہو سکے اور یہ زمین بھی جنت کا گہوارہ بن جائے۔

وقت کی ضرورت ہے کہ ہم صبر اور استقامت سے کام لیں، ہمیں دوسروں کی اُن باتوں کو برداشت کرنا ہو گا جو ہمیں ناگوار گزارتی ہیں۔ جب ہم ان لوگوں کی باتوں کو صبر کے ساتھ سنیں گے جو عدم رواداری کا مظاہرہ کرتے ہیں تو اُن کے دل بھی نرم ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اس طرح آپ کو بھی سنتے ہیں اور بولنے کا موقع دیتے ہیں۔ جس طرح نبی ﷺ کا طرز تھا وہ اپنے مخالفین کی بات سنتے اور اگر اُن میں سے کوئی نبی کریم ﷺ کو جسمانی تکلیف بھی دیتا تو نبی کریم ﷺ اُس کو برداشت کرتے، آپ ﷺ کے اس طرز سے بہت سے یہودی اور کافر متاثر ہوئے اور انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اب عصرِ حاضر کا تقاضا ہے کہ ہم بھی نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کو جو صوفیا نے اپنے اشعار اور حکایات کے ذریعے لوگوں میں پھیلایا تھا، اب ہم دوبارہ اُن کا پرچار کریں اور اُن کو معاشرے میں عام کریں تاکہ بیرونِ ممالک میں جو غیر مسلم ہیں اُن کے دلوں میں اسلام کا جو خوف اور نفرت ہیں وہ ان صوفیا کی تعلیمات سے ختم ہو جائے۔ اور وہ مسلمانوں اور اسلام کو حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھیں۔ ہمیں ان تعلیمات کو عام کرنے کے لیے مختلف سیمینار منعقد کرنے ہوں گے۔ بذریعہ رسائل اور مہینہ وار کتابچہ کی صورت میں مولانا رومؒ کی تعلیمات امن محبت اور رواداری پر مشتمل تعلیمات کو لوگوں کے سامنے لانا ہو گا۔ تاکہ ہم ایک پُر سکون ماحول اور معاشرے کو قائم کر کے اُس میں زندگی گزار سکیں۔ مندرجہ بالا بحث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ صوفیاء کی تعلیمات کو عام کرنے سے دہشت گردی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور امن و سلامتی، محبت و رواداری کا قیام بھی ممکن ہو سکے گا۔ آج کچھ قوتیں نوجوانوں کو بہلا پھسلا کر تشدد کے راستے پر لے جانا چاہتی ہیں۔ اگر آنے والی نسل کو تشدد اور دہشت گردی سے روکنا ہے تو انہیں صوفیہ کی تعلیمات سے دنیا کو روبرو کرنا ہو گا۔

فصل سوم: بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کی تعلیمات کا تقابل

صوفیا کرام کی تعلیمات ہر دور میں ہمارے لیے مشعلِ راہ رہی ہیں۔ صوفیا نے بہت سے دلوں میں اسلام کی شمع روشن کی، اور بہت سے دلوں سے اسلام کی نفرت کو مٹایا، اور اس زمین میں فساد اور فتنہ کو ختم کر کے اس کی جگہ امن و محبت، بھائی چارہ و اخوت اور رواداری کو فروغ دینے میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ لیکن ہر دور میں اُن کو نئے چیلنجز کا سامنا رہا ہے، اور انہوں نے ہر طرح سے نبی کریم ﷺ کی بتائی ہوئی تعلیمات کو پھیلانے میں کوئی کمی نہیں کی۔ صوفیا کرام کی تعلیمات وہی رہیں جو نبی کریم ﷺ کی تھیں۔ صوفیا نے آپ ﷺ کے اسوہ حُسنہ کی پیروی کرتے ہوئے اس دنیا میں امن و سلامتی، محبت اور رواداری کو قائم کیا۔ جس کی اسلام میں بہت اہمیت ہے۔ ہر دور میں صوفیا کے لیے نئے مسائل کا سامنا تھا۔ بابا فریدؒ کی جس معاشرے میں اصلاح کی ذمہ داری تھی۔ اُس دور میں ہندوستان میں اسلام کی شمع چند دلوں میں روشن ہو چکی تھی، مگر بہت سے لوگ اس دولت سے محروم تھے۔ اس کے برعکس مولانا رومؒ نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی وہ بالکل مختلف تھا اس وقت تاتاریوں نے تباہی کی حدیں پار کی ہوئی تھی۔ اُس وقت کے لوگوں نے ہر طرف خونریزی ہی دیکھی تھی اور بات بات پر جھگڑا کرنا، عدم برداشت اور عدم رواداری کا مظاہرہ ہر طرف تھا۔ بابا فریدؒ نے دو مختلف قوموں کو، جبکہ مولانا رومؒ نے ایک ایسی قوم جس کے اندر سے پیار و محبت اور امن سامتی اور رواداری کا مادہ ختم ہو چکا تھا۔ اِن کو قرآن و احادیث کے ذریعے ایک امن پسند اور روادار قوم بنایا۔

جہاں ان دونوں کی تعلیمات میں امن و محبت، سلامتی و بھائی چارہ اور رواداری کا پہلو ایک جیسا ہے۔ وہاں اِن کی تعلیمات کے طرز میں چند باتیں مختلف بھی ہیں۔

بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کی تعلیمات میں مشترک پہلو

تمام صوفیا کرام کی تعلیمات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ان کی تعلیمات میں فرق نہیں ہوتا صرف وقت اور حالات کے تقاضے بدل جاتے ہیں، اور صوفیا کے اندازِ بیان میں فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کی تعلیمات میں مشترکیت کے پہلو مندرجہ ذیل ہیں:

سماجی امن اور باہمی رواداری:

دونوں بزرگوں کے مقاصد ایک ہی ہیں معاشرے میں امن و محبت اور رواداری کا پرچار کرنا۔

دونوں صوفیا کی تعلیمات میں جو بات سب سے اہم اور خاص ہے وہ امن و رواداری ہے۔

ان صوفیائے اکرم نے سماجی، تہذیبی ادبی مذہبی اور اخلاقی زندگی کو متاثر کیا۔ دراصل صوفیاء نے اپنی روحانی طاقت اپنے کردار اور اپنی گفتار، اپنے ایثار اور اپنے خلوص و رواداری سے ایسی فضا قائم کی جو امن و آشتی، تزکیہ نفس اور اصلاح معاشرہ کی ضامن تھی۔

بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کی تعلیمات کے بہت سے پہلو مشترک ہیں۔ میرے مقالے سے متعلقہ جو تعلیمات ہیں میں ادھر اُن کا ذکر کروں گی۔

اصلاح نفس:

بابا فریدؒ کی تعلیمات امن و رواداری کا ایک نمایاں پہلو اپنے نفس کی اصلاح ہے۔ اگر ہم اپنے نفس کی اصلاح کر لیں تو معاشرہ اور ہر وہ جگہ جہاں ہمارا وجود ہو گا، اُدھر خیر ہی خیر ہو گی۔ اس لیے بابا فریدؒ نے انسان کی اصلاح میں سب سے پہلا وار نفس پر کیا ہے جو ظلم اور تعدی، جہالت اور بربریت کا منبع ہے۔ نفس کو جتنا زیادہ شکستہ اور مغلوب و مقہور کرنا ہو، اتنی ہی کڑی ریاضتیں اور مجاہدے تجویز کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح جو اخلاق پیدا کرنا مقصود ہے وہ کسب اور مجاہدے سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ نفس کشی کے لیے مجاہدے کو کہیں حرام نہیں کیا گیا، بلکہ اس نفس کشی کا مقصد و غایت بھی اخلاق رزیلہ سے طہارت حاصل کرنا ہے۔ مجاہدات سے نفس قابو میں آجائے تو سالک میں وہ قوت مدافعت بالکل نہیں رہتی، جو نفس کو برائی کے لیے اُبھارتی ہے، اور نہ وہ انانیت رہتی ہے جو جو دوسروں پر جارحانہ حملے کرتی ہے یا اوروں کا حق چھیننا چاہتی ہے جس سے مکر و حرص اور تکبر و حسد کے امراض پیدا ہوتے ہیں۔[1]

اسی طرح مولانا رومؒ کی تعلیمات امن و رواداری کا ایک نمایاں پہلو اپنے نفس کو لگام دینا ہے۔ نفس کی اصلاح دراصل امن و سکون کی علامت ہے۔ کیونکہ اگر ہمارے نفس کی اصلاح ہوئی ہو گی تو وہ ہمیں بُرے کاموں اور فتنہ و فساد پھیلانے سے روکے گا جو کہ معاشرے میں امن و سکون اور محبت کی علامت ہے۔

---

[1] فاروقی، نثار احمد، **چشتی تعلیمات اور عصرِ حاضر میں اُن کی معنویت**، ص 28۔

نفس کی آفات کا علاج اور اس کی سرکشی کو قابو میں لانے کا طریقہ تقریباً تمام مشائخ نے اس پر زور دیا ہے۔ نفس کی تمثیل مولانا رومؒ نے ایک سانپ سے دی ہے اور کہا ہے کہ سانپ نہایت موذی جانور ہے جو انسان کو تھوڑی ہی دیر میں ہلاک کر دیتا ہے۔اس کی اصلاح کے بارے میں مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ اس کو قابو میں لا کر اس کے دانت توڑ دیئے جائیں تا کہ بندہ اس سے محفوظ رہے اور معاشرے میں امن رہے۔[1]

مولانا رومؒ اس بارے میں فرماتے ہیں کہ قلبِ انسانی ایک نورانی چیز ہے اور اس میں ایک فرشتہ متعین ہے جو انسان کو نیک کاموں کے لیے راغب کرتا ہے۔ لیکن جب دل نفس کی ہمسائیگی سے زنگ آلود ہو جاتا ہے تو دل میں بُرے خیالات اور بُرے کام سے سیاہ دھبے لگ جاتے ہیں حتیٰ کہ دل گناہوں کی وجہ سے بالکل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی اپنے دل کو صقیل کرنا چاہیے تو اللہ کے ذکر کی ضرب لگاتا رہے، جس سے یہ ایک دن، دل سفید اور چمکدار ہو جائے گا۔ نفس کی صفت خباثت پر رکھی گئی ہے اس کو جتنا بھی صاف کرنے کی کوشش کی جائے تب بھی یہ خبیث ہی رہے گا۔اس کا علاج بزرگوں نے اس بات پر رکھا ہے کہ نفس کو مشقت میں ڈالا جائے تو یہ تھک کر اپنی عادت کو بدل ڈالتا ہے۔اور انسان کی تابعداری میں آ جاتا ہے، اور نفس شریعت کے کاموں مبتلا کیا تو وہ اس میں موجود مشقت سے بھی تابعدار ہو جاتا ہے اور انسان کو بڑی بڑی کرامات کا مالک بنا دیتا ہے۔ بزرگوں کے تصرفات بھی نفس کی اصلاح کے بعد ہی نظر آتے ہیں۔ مولانا اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ بزرگوں کے تصرفات سے مراد ہے کہ انسان مجاہدہ کرے اور ریاضات کرے جس سے انسان کا نفس راہِ راست پر آ جاتا ہے اور اس کے تمام معاملات درست ہو جاتے ہیں۔[2]

بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کی تعلیمات معاشرے میں امن و محبت قائم کرنے اور معاشرے سے فتنہ و فساد اور تعصب کو ختم کرنے میں بہت معاون ثابت ہوئی ہیں۔

از محبت سنگ روغن می شو　　بے محبت موم آہن می شود[3]

ترجمہ: محبت سے پتھر تیل بن جاتا ہے، بغیر محبت کے موم لوہا بن جاتا ہے۔

---

[1] عبدالطیف خان، **سوز و ساز رومی**، ص293۔

[2] ایضاً، ص296۔

[3] رومی، جلال الدین رومی، **مثنوی معنوی**، دفتر دوم، ص281۔

فریدا جو تیں مارن مکیاں تناں نہ مارے گھم　　آنپرے گھر جایکے پیر تنادے چم[1]

ترجمہ: اے فریدؒ! جو تجھے زدو کوب کرنا چاہتے ہیں یعنی جو تجھے تکلیف دینا چاہتے ہیں، تو ان سے انتقام نہ لے بلکہ ان کے درِ دولت پر جا کر ان کی قدم بوسی کر یہ حلم وانکساری کی انتہا ہے۔

صبر اور برداشت:

ان دونوں ہستیوں کی تعلیمات میں صبر کی تعلیمات نمایاں اور مشترک ہیں۔ صبر کا دامن تھام کر ہم دونوں جہانوں میں کامیاب ہیں اور اس معاشرے میں محبت کا بیج بو سکتے ہیں۔ جب ہم دوسروں کی باتوں کو صبر سے برداشت کریں گے تو معاشرے میں امن رہے گا اور ایک حد کے بعد دوسرا اپنی غلط بات پر نادم ہو گا۔ دونوں صوفیا نے صبر کی تلقین کی ہے لیکن اپنے اپنے انداز میں۔

صبر منجھ کمان اے صبر کافی ھنو　　صبر سندا بان خالق خطانہ کری .[2]

ترجمہ: جس شخص کے دل میں صبر کی کمان ہو، صبر کا چلہ ہو اور صبر کا ہی تیر ہو تو خدا اسکا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا۔ بابا فریدؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ برحق صبر کا پھل ضرور دیتا ہے

صبر و خاموشی جذوبِ رحمت ست　　ویں نشاں جُستن نشانِ علت است[3]

ترجمہ: صبر اور خاموشی رحمت کو کھینچنے والی ہے۔ اور یہ دلیل طلب کرنا ہماری بیماری کی علامت ہے۔

بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ میں معاشرے کی اصلاح کے کردار ادا کرنے میں جہاں بہت سی باتوں میں مطابقت ہے۔ وہاں رواداری کے فروغ میں بھی یکسانیت ہے۔ دونوں صوفیا کے زمانے الگ الگ تھے مگر رواداری کو معاشرے میں قائم کرنے کے سلسلے میں دونوں بزرگوں کے لیے ضروری تھا۔ جو کہ اب تک بھی اشد ضروری ہے۔

صبر ایہو سواوجے توں بندہ دڑھ کرے　　ودھ تھیوے دریاؤ ٹٹ نہ تھیوے واہڑہ[4]

---

[1] . Guru Granth Sahib, (S. Gurbachan Singh Bedi), 5881.

[2]. Guru Granth Sahib, (S. Gurbachan Singh Bedi), 5905.

[3] رومی، جلال الدین، **مثنوی معنوی**، دفتر سوم، ص335۔

[4]. Guru Granth Sahib, (S. Gurbachan Singh Bedi), 5906.

ترجمہ: اے بندے صبر ہی زندگی کا حاصل ہے۔ اگر تو صبر پر کامل یقین رکھے گا۔ تو ایک دریا کی صورت اختیار کرے گا، یعنی باصبر زندگی سے تو ساری دنیا پیار پائے گی۔ تیرا دل دریا ہو جائے گا۔ اس کے برعکس جو تو صبر کا دامن چھوڑے گا۔ تو ایک چھوٹے نالے کی مانند ہو جائے گا۔

زانکہ خوشخو آں بود کو در خُمول　　باشد از بدخوی و بدطبعاں حمول[1]

ترجمہ: کیونکہ اچھی عادت والا وہ ہے جو گوشہ تنہائی میں، بدعادت اور بدطبیعت والوں کو برداشت کرنے والا ہو۔

اسلام کی تعلیمات میں صبر کی اہمیت کو بار بار بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو بھی آزمایا اور انہوں نے بھی صبر کیا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اُن کے درجات اور بلند کیے اور اُن کو ہمارے لیے مثال کے طور پر بار بار قرآنِ پاک میں ان کا ذکر کیا۔ اسی طرح ہر ایک بزرگانِ دین اور صوفیا کرام نے بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کی پیروی کی اور اپنے مریدین کو اس بات کی ہدایت دی کہ چاہیے جو ہو جائے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے، اس سے اللہ کی نعمتیں مزید میسر آتی ہیں۔

ذکر اللہ کی فضیلت واہمیت:

جس طرح باقی معاملات میں ان دونوں بزرگوں کی تعلیمات ایک طرز کی ہیں۔ اسی طرح ذکر کی فضیلت میں بھی یہ یکساں ہیں۔ جس طرح پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ صوفیا کرام کی تعلیمات میں ہمیشہ یکسانیت ہوتی ہے فرق بس اس بات کا ہوتا ہے کہ حالات بدل جاتے ہیں جس کی وجہ سے تعلیمات میں فرق ہوتا ہے ورنہ ہر صوفی اللہ اور رسول ﷺ کی بات کو آگے پھیلاتا ہے۔

ذکر اللہ کی فضیلت میں قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾[2]

ترجمہ: وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے تسکین ہوتی ہے، خبردار! اللہ کی یاد ہی سے دل تسکین پاتے ہیں۔

---

[1] رومی، جلال الدین، **مثنوی معنوی**، ج4، ص450۔

[2] الرعد:28۔

تعلیماتِ چشت میں یعنی بابا فریدؒ کی تعلیمات میں ذکر واذکار کا بھی بڑا اہتمام تھا۔ ذکر میں تکبیر کہنا، تسبیح کرنا اور اللہ کی حمد کرنا ہے جس سے مقصود یہی ہے کہ انسان بار بار صبح و شام ورد کر کے خوب اچھی طرح یہ ذہن نشین کر لے کہ اللہ اکبر یعنی حقیقی اور سچی بڑائی صرف اللہ ہی کے لیے ہے۔ سبحان اللہ کا ورد کرے تو اس کو معلوم ہو کہ اللہ ہر عیب و اضافت سے پاک ہے۔ کوئی انسان اپنے تقدس کا، اپنی بے نیازی اور بے احتیاجی اور معاصی آلودگیوں سے پاک ہونے کا گھمنڈ نہ کرے۔ اس سے انھوں نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ جو اللہ کی اطاعت و عبادت کرنے والے بندے ہیں۔ اُن پر حمد و ثنا کی ذمہ داری بھی زیادہ ہو جاتی ہے، کیونکہ اطاعت موجبِ قربت بھی ہے اور باعثِ ازدیا نعمت بھی۔ جو شخص جتنا شکر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کو اور زیادہ نوازتا ہے۔ اس لیے اُن کا ہر بُنِ موز بان بن کر ہمہ وقت شکر ادا کرتا رہے تب بھی وہ اس کا زرہ بھر حق ادا نہیں کر سکتے اور چونکہ یہ نکتہ ان کے علم میں ہوتا ہے کہ ہم سے حقِ نعمت ادا کرنا ممکن نہیں، اس لیے اپنی کوتاہی اور تقصیر اور عاجزی و درماندگی کا اعتراف ہوتا ہے اور خدا کی محبت و خوف و خشیت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ بابا فریدؒ ادھر اس نکتہ کی طرف توجہ دلا رہے کہ جس بندے کو اللہ کا خوف ہوتا ہے وہ بندہ ہر اُس کام سے پرہیز کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہو اور جو فتنہ و فساد کا باعث ہو۔

بابا فریدؒ کے نزدیک جنھوں نے منازلِ سلوک طے کر کے مرتبہ صدیقت حاصل کر لیا ہے اور اپنی عبادت اور طلبِ رضائے حق سچے اور صادق نکلے ہیں ان کی صحبت اختیار کرو۔ ذکر سے منازل طلب و تحقیق آسان اور قلب میں محبت کی گرمی اور توانائی پیدا ہوتی ہے۔ محبت کی یہی توانائی اور گرمی قلب کی زندگی ہے۔ جس دل میں محبت نہ ہو وہ محبت کی بات بھی نہیں کر سکتا، اور نہ باعث محبت بن سکتا ہے[1]۔

بابا فریدؒ دراصل اس بات کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ جن لوگوں کے دلوں میں محبت نہ ہو وہ امن و سکون و رواداری کے پیکر نہیں ہو سکتے اور نہ وہ امن کے داعی بن سکتے ہیں۔ اور نہ معاشرے میں امن و محبت اور رواداری کو عام کر سکتے ہیں۔

مولانا رومؒ نے بھی اس نکتے کو بہت بہترین انداز سے بیان کیا ہے۔ صوفیا کرام کی تمام باتیں اور تعلیمات یکساں ہیں بس اندازِ بیان مختلف ہے۔ مولانا رومؒ ذکر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ذکرِ الٰہی ہی اللہ تعالیٰ کی محبت کا بہترین ذریعہ ہے۔ سالکانِ راہِ طریقت ذکر ہی سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتے ہیں۔ یہ اللہ کی محبت کی علامت ہے اور محبت جس

---

[1] فاروقی، **چشتی تعلیمات اور عصرِ حاضر میں اُن کی معنویت**، ص 73۔

سے ہو اُس کا ذکر اکثر ہی ہوتا رہتا ہے۔اولیاء کرام کا کشف روحانی تصرف مراقبہ اور مشاہدہ ذکرِالٰہی کے باعث ہوتا ہے۔اس میں کونین کا مشاہدہ اور لوحِ محفوظ تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔اگر دل ذکرِالٰہیٰ سے صقیل ہو جائے تو دل کے آئینہ میں ہر چیز کا مشاہدہ ہو جاتا ہے۔حضرت بہاؤالدین نقشبندیؒ نے فرمایا ہے کہ ہم چالیس سال سے آئینہ داری کر رہے ہیں اور ہمارے آئینہ نے کبھی غلطی نہیں کی۔[1]

مولانا رومیؒ نے لکھا ہے کہ جو لوگ اللہ سے ملنا چاہتے ہیں وہ سب سے پہلے صوم و صلوٰۃ کی پابندی کریں۔یعنی شریعت کا اتباع تو ہر حال میں لازم ہے،اس کے بعد اوقاتِ مقررہ میں ذکر جاری کریں اور فکر کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔فکر ایک ایسی عبادت ہے جس کی ایک ساعت ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے۔مولانا فرماتے ہیں کہ اگر فکر جامد ہو جائے تو جاؤ ذکر کرو،ذکر کرتے رہنے سے جامد شدہ فکر کھل جائے گا۔کیونکہ ذکر اور ریاضت کرتے رہنے سے فکر حرکت میں آجاتا ہے۔اس افسردہ جمود کے لیے ذکر خورشید کی طرح ہے جو قلبِ انسانی کو حرارت پہنچتا ہے۔اس پر مزید فرماتے ہیں کہ جب قلب حرارت میں جل کر کندن ہو جاتا ہے تو تب وہ خالص اللہ کے لیے بن جاتا ہے۔[2]

مندرجہ بالا وضاحت سے جو بات مولانا بیان کرنا چاہتے ہیں وہ بہت لطیف نکتہ ہے۔مولانا فرماتے ہیں کہ جس شخص نے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا ہو وہ صرف اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلے اور جو حکم اللہ نے دیا اس کی اطاعت کریں اس سے اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہوتی ہے اور بندہ ہر وہ کام انجام دیتا ہے جس کام میں محبت وامن ہو کیونکہ اُس کے دل میں اللہ بستا ہے اور جس دل میں اللہ ہو اُس میں کبھی کینہ،حسد،نفرت،عدم رواداری اور فساد جیسی بیماریاں جنم لے ہی نہیں سکتیں۔جس سے وہ بندہ معاشرے میں امن و محبت اور رواداری کا مبلغ بن جاتا ہے۔جو کہ معاشرے کا سب سے اہم فرد اور ضرورت بن جاتا ہے۔

---

[1] خان،**سوزوسازِرومی**،ص458۔

[2] خان،**سوزوسازِرومی**،ص460۔

بابافریدؒ اور مولانا رومؒ کی تعلیمات میں فرق

صوفیا کرام کی تعلیمات کے بیشتر پہلوؤں میں یکسانیت ہوتی ہے۔ مگر ہر صوفی بزرگ کے دور کے وقت کی ضرورت اور ہوتی ہے۔اور اسی مناسبت سے اُس صوفی کی تعلیمات بھی مختلف ہوتی ہے۔ بابافریدؒ اور مولانا رومؒ کی تعلیمات میں جو مختلف پہلو آئے ہیں، وہ بھی اسی مناسبت سے ہیں کہ اُس وقت جن اصلاحات کی ضرورت تھی وہ ہی ان بزرگوں نے لوگوں میں عام کی اور معاشرے اور افراد کی اصلاح کی۔

توحید کی تبلیغ:

بابافریدؒ کے وقت کی تعلیمات کا تقاضا کچھ اور تھا، اُس وقت ہندوستان میں اسلام ابھی آیا تھا۔ ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں کی نسبت زیادہ تھی۔اور قتل و غارت اور فتنہ فساد زیادہ تھا۔اس لیے بابافریدؒ نے انہیں پہلوؤں کی طرف اپنا رُخ کیا۔اور لوگوں کی اصلاح کی کوشش میں لگ گئے۔ بابافریدؒ نے انہیں توحید کی باتوں کے ساتھ ساتھ اُن کے دلوں کو بھی پاک کرنے کی طرف توجہ دی۔ان کو اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کیا۔

ارکان اسلام:

اس کے برعکس مولانا رومؒ کے وقت کے حالات کا تقاضا یہ تھا۔ کہ لوگوں کے دین ارکان پر توجہ دیں۔ مولانا رومؒ نے نماز، زکوۃ وغیرہ کی اصلاح کی طرف توجہ دی۔اس بات کا اندازہ اس شعر سے لگایا جاسکتا ہے۔

جوشش وافزونی زد در زکات		عصمت از فحشا و منکر در صلات[1]

ترجمہ: زکوۃ میں مال کا جوش اور بڑھاؤ، نمازیں بری باتوں اور فحش سے بچاؤ ہے۔

مولانا رومؒ نے اپنی مثنوی میں ہر پہلو پر لوگوں کی توجہ دلائی اور اُن کی اصلاح کی، مختلف حکایات کو بیان کر کے دین کے ہر معاملے کو سدھارنے کی کوشش کی۔ مثلاً: اپنے بُرے نفس کا خاتمہ، حسد نہ کرنا، دین کے ارکان پورے کرنا وغیرہ۔ مولانا رومؒ نے جہاں معاشرے کی بہتر طریقے سے اصلاح کی ذمہ داری پوری کی، اُدھر ہی اللہ پر پختہ یقین کرنے کی طرف راغب کیا۔انبیاء کرام کے قصص بیان کر کے لوگوں کے ایمان کو مزید پکا کیا۔

[1] رومی، جلال الدین، **مثنوی معنوی**، دفتر ششم، ص 611۔

طریقہ تبلیغ میں فرق:

بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کی تعلیمات میں اگرچہ بہت سے پہلو یکساں ہونے کے باوجود ان کے طریقہ تبلیغ میں چند ایک چیزیں اور باتیں مختلف نظر آتی ہیں۔ دراصل ایک شیخ یا دین کا مبلغ جس طرح اپنے مرید یا شاگرد کی تربیت کرتا ہے وہ اُسی طرح کی تعلیمات کو آگے پھیلاتا ہے، جس سے نہ صرف ایک فرد بنتا ہے بلکہ ایک گھر اور ایک معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ ادھر ہم جو نکتہ بیان کرنے لگے ہیں۔ وہ شاید بظاہر اتنا غور طلب نہ ہو لیکن وہ ہمارے معاشرے کے لیے ایک اہم عنصر ہے۔ بابا فریدؒ کے سلسلہ تعلیمات میں خانقاہی نظام کو نمایاں اہمیت حاصل ہے، چشتی تعلیمات کا مقصد افراد کی تربیت اس طرح کرنا ہے کہ وہ ایک پُر سکون اور پُر امن معاشرے کے داعی بن سکے۔ جس طرح ہمارے مدارس میں طلبہ کی تربیت کی جاتی ہیں۔ اُن کو پہلے سخت مشقیں کروائی جاتی ہیں۔ پھر اُس کے بعد اُن کو مریدی میں لیا جاتا ہے۔ اُس شاگرد کو صبح شام اپنے اُستادوں کی خدمت کرنا ہوتی ہے جس سے اُن کے اندر جذبہ برداشت بڑھ جاتا ہے اور پھر وہ بعد میں معاشرے کے اندر امن و رواداری کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بات اور چشتی تعلیمات میں خاص ہے کہ ازل سے لے کر اب تک اس سلسلے سے وابستہ افراد کسی صاحب اقتدار فرد سے کوئی ذاتی نذرانہ قبول نہیں کرتے، جو کہ بعد میں کسی بھی قسم کا موجبِ فساد بنے۔ اور معاشرہ میں امن و محبت اور رواداری کے داعی سبب نفرت بن جائے۔[1]

اس کے برعکس مولانا رومؒ کے سلسلہ مولویہ میں یہ چیز شامل نہیں ہے۔

بابا فریدؒ نے تبلیغ کے سلسلے میں جو طریقِ کار اختیار کیا تھا وہ یہ تھا کہ اپنی شریں کلامی اور اپنی خوش اعمالی سے لوگوں کے دلوں کو موہ لیتے تھے۔ شیخ فریدؒ اور دوسرے درویش بھی، ہندو یوگیوں سے اکثر مباحثے کیا کرتے تھے۔ ان بے تکلف مکالموں کے موقعوں پر روحانی ہم مشربی کی فضا پیدا ہوتی اور وہ سب ایک دوسرے سے بہت کچھ حاصل کر لیتے۔

سانس روکنے کی ریاضت جسے پراکس یا پران یام کہتے ہیں، اکثر صوفی بھی کیا کرتے تھے۔ اور اسے ان کی اصطلاح میں یاس انفاس کہا جاتا ہے۔ صوفی عوام کی اخلاقی روحانی تعلیم کے لیے ایک ایسا مرکب تیار کرتے جو مذہبی

---

[1] ارشد منیر، **مذہبی رواداری اور صوفیاء پنجاب**، (لاہور: ضیائے تحقیق، پنجاب یونیورسٹی، 2008)، ص 90۔

منافرت کے جذبے سے پاک ہوتا۔اس پس منظر میں صوفیوں اور درویشوں کے اشاعت و تبلیغ اسلام کے کام کو دیکھا جائے تو اندازہ ہو گا کہ تمام تر نتیجہ تھا۔محبت آمیز طرز عمل کا اور سچی عقیدت مندی کا۔اُس دور کی مذہبی، منافرت عداوت کی فضااور شورش انگیز ماحول کے مداوے کے لیے یہ صوفی محبت و آشتی کا جو مرہم لے کر آئے تھے۔اُس کے نتیجے میں معاشرہ امن و محبت اور رواداری کا گہوارہ بن گیا۔[1]

ان صوفیانے لوگوں میں محبت کو عام کرنے کے لیے مسلک پر توجہ نہ دی بلکہ اپنی تبلیغ پر توجہ دی۔جس طرح کہ نبی کریم ﷺ نے اسلام کی تبلیغ کرتے ہوئے یہ نہ دیکھا کہ کون ہندو ہے اور کون نصرانی بلکہ ہر ایک کو اللہ کا پیغام سنایا۔جس سے پورا عرب دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا،اور جو معاشرہ فتنہ و فساد اور رسمِ جہالت میں پڑا ہوا تھا وہ ایک مہذب قوم بن گیا۔ان صوفیانے بھی نبی کریم ﷺ کے اسوہ حسنہ پر عمل کر کے اُس وقت کے فتنے کو ختم کیا،اور معاشرے میں امن و محبت اور رواداری کو عام کیا۔

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل چند پہلو بھی مختلفات میں شمار کیے گئے ہیں۔

- بابا فریدؒ نے اپنا پیغام دوسروں تک پہنچانے کے لیے اُن کے کلچر کو اپنایا لیکن مولانا رومؒ نے اس قسم کا کوئی اقدام نہ کیا۔
- بابا فریدؒ کی تعلیمات ہمیں سکھوں کی کتاب میں محفوظ ملتی ہیں یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بابا فریدؒ غیر مذہبوں کے زیادہ قریب تھے اور وہ اِن سے زیادہ متاثر ہوئے۔جبکہ مولانا رومؒ کی تعلیمات کی اپنی شناخت ہے انہوں نے ایک مسلم معاشرے میں تبلیغ کیں اور مسلمانوں میں رہ کر اپنی تعلیمات کا پرچار کیا۔

بابا فریدؒ کی طبعیت میں تنہائی پسند کا عنصر غالب تھا۔انہوں نے اپنے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کیا جہاں ہجوم نہ ہو بلکہ جنگل ہو اسی لیے انہوں نے پہلے دہلی کو اپنا مسکن بنایا جب وہاں پر لوگوں کا ہجوم زیادہ ہوا تو آپ وہاں سے ہانسی چلے گئے جو پُر سکون جگہ تو تھی مگر وہاں ٹوٹل آبادی ہندوؤں کی آباد تھی۔بابا فریدؒ نے وہاں کا ماحول دیکھا اور فرمایا کہ یہ جگہ بہتر ہے اور ایسی جگہ سے اپنی تعلیمات کا آغاز کیا۔جبکہ مولانا رومؒ کی طبعیت میں ایسا کوئی پہلو نمایاں نہ تھا انہوں نے ایک کے بعد ایک ہمزاد کو رکھا،اور اپنی تعلیمات کا پرچار کیا۔

---

[1] گربچن سنگھ، **حضرت بابا فرید گنج شکر حیات اور کارنامے**،(1985)،ص52۔

خلاصہ بحث

تحقیق میں باب اول میں بابا فرید اور مولانا روم کا تعارف ذکر کیا گیا ہے۔ بابا فریدؒ کی پیدائش مولانا رومؒ سے بتیس سال پہلے ہوئی۔ اس طویل عرصے میں دنیا میں بہت سے نئے علوم بھی متعارف ہوئے۔ بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ میں اساسی تعلیمات اسلام ہی کی ہیں۔ ان دونوں برگزیدہ شخصیات نے ان اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اپنے اپنے ادوار میں مسلمانوں کو مستفید کیا اور معاشرے کی اصلاح کی۔ مولانا رومؒ کی مثنوی قرآنی تعلیمات سے مسلمانانِ عالم اور بالخصوص آج کے وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ بابا فریدؒ کے دور میں برصغیر کے لوگوں کی اصلاح ایک اہم اور مشکل کام تھا۔ بابا فریدؒ نے ان کے دلوں پر موجود مغربی سیاہی کو مٹانے کا بیڑا اُٹھایا اور مسلمانوں کو حرکت، بیداری ،اتحاد، امن و محبت، رواداری اور یگانگت کا درس دیا۔ اس مقالے کے موضوع کو جب مولانا کی مثنوی معنوی اور بابا فریدؒ کے اشعار کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آٹھ سو صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ان بزرگوں کی تعلیمات کس قدر فائدہ مند ہیں۔

تحقیق میں باب دوم رواداری اور امن پر مشتمل ہے جس میں ان دونوں موضوعات کی تعریف و اہمیت بیان کرتے ہوئے غیر مسلموں کے تعلق کی نوعیت کیا تھی اور نبی ﷺ نے غیر مسلموں سے جو معائدے کیے ان کے اصول اور آداب کیا تھے اس کو بیان کیا گیا ہے نیز اس باب میں غیر مسلموں سے کس حد تک تعلق رکھنا چاہیے اس کو بھی واضح طور پر قرآن اور حدیث کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔

باب سوم میں دونوں شخصیات کی تعلیمات امن اور رواداری کو اشعار کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ بابا فرید اور مولانا روم نے امن و محبت اور رواداری کو اپنی تعلیمات کے ذریعہ اُجاگر کیا۔ ان صوفیا کرام نے لوگوں کا تعلق خالق کائنات سے مضبوط کرنے اور تمام مخلوق کی خدمت اور اس سے محبت کا درس دیا۔ ان صوفیا کرام کی تعلیمات نے تعلق باللہ اور انسانیت کی خدمت کو معاشرے میں فروغ دیا۔ ایک طرف انہوں نے افرادِ معاشرہ کو بلا تفریق مذہب اور تزکیہ روحانی کی تعلیم دی اور دوسری طرف انہیں انسان دوستی کا سبق سکھایا۔ یہ سبق انہوں نے صرف درس وتدریس کی صورت تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس پر عمل بھی کر کے دکھایا۔ انہوں نے تمام مخلوق سے محبت کی کسی سے دل میلا نہیں کیا کسی سے نفرت نہیں کی۔ امن و محبت کا درس دیا محبت پھیلائی اور محبت سے دل جیتے اور یہ سب اللہ کی رضا کے لیے کیا۔ سلسلہ چشتیہ کی تعلیمات کا ایک اہم اور سب سے منفرد کام یہ تھا کہ جس کی عصرِ حاضر میں بہت ہی زیادہ ضرورت

محسوس ہوئی ہے مجھے وہ یہ کہ اگر اہلِ اقتدار کی طرف سے کسی قسم کا معاشرے پہ جبر ہوتا تو اس پر جو لوگ حکومت سے منسلک ہوتے ان کو تنبیہ کرتے۔ یہ کام ان صوفیاء کرام کی خانقاہ کی بدولت ہوتا تھا۔ اگر دیکھا جائے تو وقت ایسا تھا کہ ان خانقاہوں نے حزبِ اختلاف کا حقیقی کردار ادا کیا۔ اور آج بھی اس کی اشد ضرورت ہے۔ صوفیاء کرام نے معاشرے کے سرمایہ پرست گروہوں اور اہل ثروت واقتدار سے کسی قسم کا لالچ اور امید نہ باندھنے کی تلقین کی ہے۔ خاص طور پر دین کی عزت کا خیال رکھیں۔ ایسے عطیات اور مالی مدد کو قبول نہ کریں۔ جس سے عزتِ نفس مجروح ہو اور دینی طبقہ سرمایہ داروں کے سامنے دب کر رہے اور حق بات نہ کر سکے۔ یہ صوفیاء کرام کی تعلیمات کا ایک اہم جزو ہے کہ وہ صاحبِ اقتدار لوگوں سے ہٹ کر اپنی زندگی کو بسر کرنا پسند کرتے ہیں۔

مذہبی رواداری اور معاشرے میں امن و محبت کی جہاں تک بات ہے تو اس مسئلے میں ہمارا دین ہمیں مکمل طور پر راہنمائی کرتا ہے کہ ہم نے کدھر اور کس طرح کا سلوک روا رکھنا ہے۔ غیر مذہب لوگوں کے ساتھ اس پہلو پر صوفیاء اکرم نے جو بھی تعلیمات دی وہ قرآن اور نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کو سامنے رکھتے ہوئے دیں۔ نبی کریم ﷺ نے جس طرح غیر مسلموں کے ساتھ برتاؤ کیا، اور ان کے ساتھ جس طرح کا تعلق رکھا، جن حدود و قیود کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُن کے ساتھ معاملات طے کیے۔ اُسی طرح صوفیا کرام نے بھی کیا اور ہمیں بھی اسی بات کی تلقین کی۔

تحقیق میں باب چہارم میں بابا فرید اور مولانا روم کی تعلیمات کی عصری معنویت کو بیان کیا گیا ہے۔ عصرِ حاضر میں جہاں ہر طرف مادیت پرستی کا بازار گرم ہے۔ معاشرہ افرادیت پسندی میں مبتلا ہو چکا ہے۔ تنگ نظری، فرقہ واریت، تشدد اور منافقت نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اس صورتحال میں اولیاء کرام کی سیرت اور ان کی تعلیمات کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس تناظر میں ہمیں اپنے کردار کو بھی جانچنا چاہیے کہ آج ہم کس قدر اسلام کی تعلیمات سے دور ہو چکے ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اولیاء کرام کی سیرت کو اپنا کر ہم بھی بھوکوں کا کھانا کھلانے والے بن جائے، انسان دوستی کی بنیاد پر معاشرہ تشکیل دیں۔ جس سے مفلوک الحال، پریشان حال افراد کی پریشانی ختم ہو۔ معاشرہ تنگ دستی اور فساد سے نکلے امن و محبت، اخوت اور رواداری کا ماحول پیدا ہو۔ نظرے، فکر، مسلک سے بالاتر ہو کر سب کو امن و محبت اور رواداری کا پیغام دیں، اور خود کو ہر وقت دوسروں کی مدد اور خدمت کے لیے تیار رکھیں۔ ذاتی انا کو بنیاد بنا کر دوسروں سے قطع تعلق کر دینا یا کسی بھی طرح کی نفرت کو فروغ دینا معاشرتی تباہی کا سبب ہے۔ ہم اولیاء کرام سے صرف رسمی محبت نہ رکھیں۔ بلکہ ان کی تعلیمات اور کردار کو اپنائیں تاکہ موجودہ تشدد پسندی

،انتہا پسندی، عدم رواداری کا برتاؤ اور مادیت پرستی کے مفاسد کا تدارک ہو سکے۔ مسلمانوں کے لیے لازمی ہے کہ وہ اسلامی احکامات پر عمل کریں (قرآن و حدیث) کو اپنا ماخذ بنائیں اور صوفیاء کرام کی تعلیمات سے تعلق مضبوط کریں، کیونکہ اللہ کے نیکوکار بندے اولیاءاللہ وصوفیاء کرام سے اپنا تعلق مضبوط کریں، تاکہ دنیا کی مصیبتوں سے خلاصی پاسکے۔

نتائج

1. بابا فریدؒ کے دور میں مسلم معاشرے کو درپیش اخلاقی زوال کو درست کرنے کے لیے آپ کی تعلیمات موثر ثابت ہوئیں۔
2. مولانا رومؒ کے دور میں جو منگولوں کے ہاتھوں اسلامی معاشرے کا سیاسی زوال تھا، اُس کی پھر سے بنیاد رکھنے کے لیے آپ کی تعلیمات سماجی امن و محبت اور باہمی رواداری بہت اہمیت رکھتی ہیں۔
3. بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کی تعلیمات سماجی امن و محبت اور باہمی رواداری اسلامی تعلیمات (قرآن و احادیث) سے ہی ماخوذ ہیں۔
4. یہ تعلیمات انسانی زندگی کے روحانی پہلوؤں کو مضبوط کرنے کے لیے اور مادہ پرستی سے بچنے کے لیے اہم بنیادیں فراہم کرتی ہیں۔
5. مسلمانوں کے ساتھ ساتھ بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کی تعلیمات غیر مسلم اقوام میں تبلیغ کے لیے موثر حکمتِ عملی فراہم کرتی ہیں۔
6. مسلمانوں اور غیر مسلموں میں امن و رواداری کو اُجاگر کرنے کے لیے بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ نے اپنے کلام میں اسلام کا تصور امن و محبت اور رواداری موثر طور پر بیان کیا ہے
7. بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کی شاعری کا ایک مقصد سماجی امن، محبت اور باہمی رواداری اور بھائی چارے کی تفہیم ہے۔
8. اسلامی رواداری اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ غیر مسلموں سے تعلقات اور روادای کے لیے اسلام کچھ اصول و آداب بیان کرتا ہے، جن کے اندر رہ کر تعلقات رکھے جا سکتے ہیں۔

سفارشات

1۔ صوفیاء (بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ) کی وہ تعلیمات جن میں تحمل صبر اور برداشت جیسے عناصر نمایاں ہیں۔ ان موضوعات پر مزید تحقیق کی جاسکتی ہے اور غیر مسلم سکالرز اور صوفیاء کے ساتھ تقابل بھی ہو سکتا ہے۔

2۔ صوفیا کی تعلیمات میں سے جامعات کے نصاب میں امن، محبت، رواداری، صبر اور برداشت جیسے عناوین شامل ہونے چاہیے تاکہ نوجوان نسل کی تربیت ہو سکے۔

3۔ پاکستان میں بین المسالک ہم آہنگی اور بین المذاہب رواداری کی فضا قائم کرنے کے لیے مختلف علماء و مشائخ پر مشتمل کیمٹیاں بنائی جاسکتی ہے جو ملک میں امن وامان قائم کرنے کے لیے اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

4۔ بابا فریدؒ اور مولانا رومؒ کی تعلیمات سے اپنے نفس پہ قابو پانے اور انسانیت کی تکریم جیسے پہلوؤں کو اپنانے کی ضرورت ہے۔

5۔ عصرِ حاضر میں دین سے بیزاری اور الحاد کے ماحول میں صوفیا کی تعلیمات دین کی دعوت کے لیے مؤثر ثابت ہو سکتی ہیں۔

فہرستِ آیات

نمبر شمار	آیت	سورت	آیت نمبر	صفحہ نمبر
1	اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ––	النحل	125	51
3	اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ––	رعد	28	139
4	اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّیِّبَاتُ وَطَعَامُ الَّذِیْنَ––	المائدہ	5	85
5	آاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِیْنَ لِلّٰهِ–––	المائدہ	8	87
6	فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا–	آلِ عمران	159	59
7	قُلْ یٰٓاَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ ---	آلِ عمران	64	43,51,83
8	لَّا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكَافِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ–– –	آلِ عمران	28	84
9	لآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ ---	البقرہ	256	83
10	وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا–––	الاسرا	34	88
11	وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی––	المائدہ	2	87
12	وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَیُدْهِنُوْنَ---	القلم	9	82

13	وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ-- -	الانعام	108	92
14	وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي اٰدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ ---	الاسرا	70	41
15	وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ	شوریٰ	43	116
16	وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ -	یونس	99	41
17	وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً-- -	ھود	118	41
18	وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا	المائدہ	32	41
19	يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً---	آلِ عمران	118	80
20	يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى- --	الحجرات	13	45

فہرست احادیث

نمبر شمار	حدیث کا متن	کتاب کا نام	صفحہ نمبر
1	انْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومً	الصحیح البخاری	62
2	إِنَّهَا جِنَازَةُ يَهُودِيٍّ قَالَ إِذَا رَأَيْتُمْ الْجِنَازَةَ فَقُومُوا	الصحیح البخاری	53
3	السِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ، وَقِتَالُهُ كُفْرٌ	الصحیح البخاری	117
4	الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ وَمَنْ كَانَ فِي حَاجَةِ	الصحیح مسلم	61
5	المسلم من سلم المسلمون من لسانه و يديه	الصحیح البخاری	116
6	مَنْ أَشَارَ إِلَى أَخِيهِ بِحَدِيدَةٍ فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَلْعَنُهُ	الصحیح مسلم	52
7	مَنْ أَعَانَ عَلَى قَتْلِ مُؤْمِنٍ بِشَطْرِ كَلِمَةٍ	ابن ماجہ	48
8	مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السِّلاَحَ فَلَيْسَ مِنَّا	الصحیح البخاری	117
9	مَنْ قَتَلَ مُعَاهَدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ	الصحیح البخاری	117

فہرستِ اشعار

نمبر شمار	شعر کا متن	جلد نمبر	کتاب کا نام	صفحہ نمبر
1	از محبت تلخہا شریں شود----	دوم	مثنوی معنوی	101
2	از محبت خارہا گل می شود----	؍	؍	؍
3	از محبت سُقم صحت می شود---	؍	؍	؍
4	اک پھکانہ گالائے سبھناں میں سچا دھنی- --		؍	98
5	اے برادر صبر کن بر دردنی----	؍	؍	100
6	باھوئ وآرزو کم باش دوست---	اول	؍	133
7	برہا برہا اکھیے، برہا توں سلطان---		Sri Guru Granth Sahib in Gurmukhi	98
8	چوں صبوری پیشہ کرد ایوب راد---	ششم	؍	101
9	چون سزای این بتِ نفس اوندا د----	اول	؍	128
10	دست کورانہ بحبل اللہ زن---	ششم	؍	100
11	رنجِ یک جزوے تن رنجِ ہمہ ست----	؍	؍	؍
12	رنج بد خویاں کشیدن زیر صبر -----	ششم	؍	131

13	زانکہ خوشخوآں بود کودر خُمول---	چہارم	؍	103, 138
14	سبھان من مانک، ٹھاہن مول مچانگوا---		Sri Guru Granth Sahib in Gurmukhi	95,119
15	صبر صدر آمد بہر حالت کہ ہست----	؍	؍	98
16	صبر ازایمان بیابد سر کلہ-----	دوم	؍	129
17	صبر ایہو سواوجے توں بندہ دڑھ کرے--		Sri Guru Granth Sahib in Gurmukhi	93,138
18	صبر منجھ کمان اے صبر کافی ھنو— صبر منجھ کمان اے صبر کافی ھنو		؍	137
19	صبر وخاموشی جذوبِ رحمت است----	سوم	؍	101,137
20	فریدا جو تیں مارن مکیاں تناں نہ مارے گھم--		Sri Guru Granth Sahib in Gurmukhi	94,120,137
21	فریدا بُرے دا بھلا کر غصہ من نہ ہنڈ ھائے---		؍	94,118
22	فریدا من میدان کر ٹوٹے بٹے ڈھاہ---		؍	94,117

23	گرتواشکالی بکلی و خرج----	اول	مثنوی معنوی	101
24	گفت پیغمبر خداش ایمان نه دار----	دوم	〃	〃
25	گفت لقماں صبر نیکو ہمد مسیت---	〃	〃	102
26	ہر کرا بنیی برہنہ و بنیوا-----	〃	〃	101
27	ہر کرا بنپی یکے جامہ درست----	ششم	〃	〃

فہرستِ مصادر و مراجع

مقدس کتب

القران الکریم

The Sri Guru Granth Sahib in Gurmukhi & Shahmukhi, (S. Gurbachan Singh Bedi) , Ottowa, Canada.

عربی مصادر

بخاری، محمد بن اسماعیل، **الجامع الصحیح** (ریاض،دارالسلام،1999)

القشیری، مسلم بن حجاج، **الجامع الصحیح** ،(ریاض:دارالسلام للنشر والتوزیع،1999ء)

السجستاني،ابوداود سلیمان بن الاشعث،**السنن**،(ریاض:دارالسلام للنشر والتوزیع،1999ء)

ابن ماجہ، محمد بن یزید،**السنن**،(ریاض:دارالسلام للنشر والتوزیع،1999ء)

ابن عاشور،طاھر،**مقاصد الشریعه الاسلامیه**،(تونس،الشرکه التونس للنشر والتوزیع،2011)

أحمد مختار عبدالحمید عمر،**معجم اللغة العربیة المعاصرة**،(بیروت:عالم الکتب، 2008)

الازھری، محمد کرم شاہ،**ضیاء النبی ﷺ**(لاہور:ضیاالقرآن پبلی کیشنز،2015)

حمیداللہ، محمد،**الوثائق السیاسیہ**(بیروت:دارالنفاس،1985)

خلیفہ،عبدالحکیم،**تشبیاتِ رومی**،(لاہور:ادارہ ثقافت اسلامیہ،1909)

قشیری،عبدالکریم،**الرسالۃ القشیریۃ**(موسسۃ دارالشعب للصحافۃ واطباعۃ والنشر،1989)

معدي،الحسيني الحسيني،**موسوعة الصوفية**(قاھرہ:کنوز للنشر والتوزیع،2013)

اردو مصادر

احمد، محمد مسعود، ''**رواداری تاریخ کی روشنی میں**''(مقالہ برائے پی ایچ ڈی،ادرہ مسعودیہ پاکستان 1997)

الازہری، علی اکبر، ''**عصر حاضر میں مسلم ریاست کے غیر مسلم ریاستوں سے تعلقات: معاہدات نبوی کے تناظر میں**''،العلم،جلد2،شمارہ2،(2018)

اسلم، محمد، ''**قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کے غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات**''(مقالہ برائے پی- ایچ ڈی پنجاب یونیورسٹی لاہور،2002)

اشرفی، محمد طاہر **محمود، رواداری سیرت طیبہ کی روشنی میں**،(لاہور: عمر پبلیکیشنز،2016)

آنند، بلونت سنگھ، **فرید نانک بلھا**،(لاہور: المطبعہ العربیہ،2008)

باغبتی، متین طارق، **اسلام اور رواداری**،(دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی،1986)

بیگ، عبدالباقی، **جہانِ رومی**،(نئی دہلی: پبلی کیشنز حکومت ہند،2009)

پرویز، امجد، "**معاصر معاشرت میں سماجی رواداری کا حصول: سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں**"، القمر، جلد2، شمارہ 1،(2019)،12-1۔

پریمی پرکاشک، **دوھے بابا فرید جی**،(دہلی: چاند بک ڈپو کھاری باؤلی، س ن)

جسٹس پراچہ، الشکور، **اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور**،(2018)

جعفری، رئیس احمد، **اسلام اور رواداری**،(لاہور: رفیق ادارہ ثقافت اسلامیہ،1957)

جمالی، حامد بن فضل اللہ، **سیر العارفین**، مترجم، محمد ایوب قادری،(لاہور: مرکزی اردو بورڈ،1976)

حسین، سید اصغر، **سوانح مولانا روم**،(لاہور: ادارہ اسلامیات، س ن)

حمید اللہ حیدر آبادی، **سیاسی وثیقہ جات**، مترجم، ابو یحیٰی امام خاں(لاہور: مجلس ترقی ادب کلب روڈ،2005)

حمید اللہ، محمد، **اسلامی ریاست**،(لاہور: الفیصل کتب اُردو بازار،2005)

حمید اللہ، محمد، **پیغمبر امن حضرت محمد ﷺ**،(لاہور: مکتبہ دانیال،2010)

خان، عبدالطیف، **سوز و ساز رومی**،(لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ،2008)

خاں، محمد عبدالسلام، **افکارِ رومی**،(نئی دہلی: مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ، 2011)

ذاکر، کشمیری لال، **حضرت بابا فرید گنج شکر فن اور شخصیت**(ہریانہ: ہریانہ اردو اکادمی،2010)

راشدی، زاہد "**غیر مسلموں سے سلوک اور سیرت نبوی ﷺ**"(ورجینیا: دارالہدیٰ2007)

رومی، جلال الدین، **مثنوی معنوی** (رینولد الین نیکلسون، س ن)

سجاد، محمد، "**غیر مسلموں سے تعلقات اور بقائے باہمی کی اساس، سیرت النبی ﷺ کے تناظر میں**"، العلم، جلد2، شمارہ2، (2018)،189-173۔

سراج، منہاج، **طبقاتِ ناصری**، مترجم، غلام رسول مہر(لاہور: مرکزی اُردو بورڈ،1975)

سعدیہ، سیدہ، "**قیام امن اور حیات نبوی ﷺ**"،(لاہور: مقالہ برائے پی-ایچ ڈی، پنجاب یونیورسٹی،2017)

سنگھ، بچن، **بابا فرید دے اشلوک**،(لاہور: پیسہ اخبار سٹریٹ، س ن)

شارق، محمد، ”**بین المذاہب رواداری، اسلوب اور دائرہ کار**،“(مقالہ برائے ایم۔فل، شعبہ علوم اسلامیہ وفاقی اُردو یونیورسٹی، کراچی، 2007)

ضیاء، راشد، ”**غیر مسلموں کے ساتھ رواداری برتنا**“ قومی ترجمان، 10 جنوری 2021۔

طارق، حافظ محمد، **رواداری کا اسلامی تصور سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں**،(لاہور: مقالہ برائے پی۔ایچ ڈی، پنجاب یونیورسٹی، 2017)

طالب، گربچن سنگھ، **بابا شیخ فرید الدین گنج شکرؒ حالاتِ زندگی اور تعلیمات**،(پیٹیالہ: بابا فرید میموریل سوسائٹی پنجابی یونیورسٹی، 1973)

عامر، محمد، ”**ادیان ثلاثہ اور مذہبی رواداری: تحقیقی و تقابلی جائزہ**“،(مقالہ برائے پی۔ایچ-ڈی، کراچی، 2004)

عبدالحیٔ، محمد، **رواداری**،(رام پور: مرتضیٰ پریس، س ن)

عبدالرحمن، سید صباح الدین، **ہندوستان کے سلاطین علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر**،(دار المصنفین اعظم گڑھ، 1970)

عبدالرحمن، سید صباح الدین، **اسلام میں مذہبی رواداری**،(اعظم گڑھ: دار المصنفین شبلی اکیڈمی، 1987)

عمری، مولانا سید جلال الدین، **غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق**،(نئی دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، 2007)

غزنوی، محمد داود، **اسلامی ریاست کے اساسی اصول و تصورات**،(لاہور: مکتبہ نذیریہ، 1986)

فاروقی، نثار احمد، **چشتی تعلیمات اور عصرِ حاضر میں ان کی معنویت**، (نئی دہلی: اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی، 1981)

فخری اوز چاکل، ”مولانا روم کی تعلیمات کو اسلام فوبیا کے خلاف مثال بنایا جائے“ ترکش ریڈیو، 2017-1-30

فقری، عالم، **شانِ حضرت بابا فرید گنج شکر**،(لاہور: اشتیاق پرنٹرز لاہور، 2004)

فیروز الدین، **فیروز اللغات اردو جامع**،(لاہور: مطبوعہ فیروز سنز، 2010)

قادری، محمد طاہر، **سیرۃ الرسول ﷺ**(لاہور: منہاج القرآن پبلی کیشنز، 2015)

قاسمی، شوکت علی، **اسلامی رواداری**،(دیوبندی: اسلامیہ عربیہ دار العلوم دیوبند، س ن)

قریشی، محمد صدیق، **رسول ﷺ کی سیاستِ خارجہ**، (نئی دہلی: تاج پرنٹرز نجف گڑھ روڈ نئی دہلی، 1985ء)

کمالی، احمد، "**تصوف کا مفہوم**"، جسارت بلاگ، 31 مئی 2021

گنج شکرؒ، فرید الدین، مترجم محمد معین الدین دردائی، **اسرار اولیا اُردو ترجمہ ملفوظات**، (کراچی: رشید اینڈ سنز پرنٹرز ناظم آباد، 1971)

ممتاز، محمد "**بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کی شاعری کا سماجی مطالعہ**"، الماس، (2020)

منیر، ارشد، **مذہبی رواداری اور صوفیا پنجاب**، (لاہور: ضیائے تحقیق، پنجاب یونیورسٹی، 2008)

مودودی، سید ابوالاعلیٰ، **تفہیمات**، (لاہور: شاہ عالم مارکیٹ، 2000)

ندوی، عبدالباری، **تجدید تصوف وسلوک** (المکتبہ الاشرفیہ، 1949)

ندوی، سید ابوالحسن علی، **مولانا جلال الدین رومی** (اسلام آباد: دعوۃ اکیڈمی، 2011)

ندوی، سید ابوالحسن علی، **تاریخ دعوت وعزیمت** (لکھنو: کاکوزی آفسیٹ پریس، 2010)

نصیر الدین یحیٰی المعروف بابن بی بی، **سلجوق نامہ**، مترجم، محمد زکریا مائل، (لاہور: مرکزی اُردو بورڈ، 1975)

نظامی، خلیق احمد، **سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات**، (دہلی: مطبوعہ الجمعیۃ پریس، 1958)

نظامی، خلیق احمد، **تاریخ مشائخ چشت** (دہلی: مطبوعہ اشوکا پریس، 1953)

نعمانی، شبلی، **سوانح مولانا روم**، (بنگال: ممبر رائل ایشیاٹک سوسائٹی، 1906)

نور الدین، "**اسلام میں رواداری کا تصور**"، (مقالہ برائے پی-ایچ۔ڈی، شعبہ علوم اسلامیہ بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، س ن)

ہاشمی، طالب، **سیرت خلیفۃ الرسول سیدنا ابو بکر صدیقؓ**، (لاہور: حسنات اکیڈمی، 1990)

English Sources:

The Sri Guru Granth Sahib in Gurmukhi & Shahmukhi, (S. Gurbachan Singh Bedi), Ottowa, Canada.

Anjum, Muhammad Rafique, "Concept of Peace in World's Major Religions: An Analysis", *International Journal of Scientific and Research Publications*, 7:4, (2017), 244-258.

Coleman Barks, *Rumi: The Book of Love: Poems of Ecstasy and Longing*, (New York: HarperCollins, 2002)

Connolly, Peter, *Approaches to the Study of Religion* (London: The Continuum International Publishing Group, 1999)

F. du Pre Thornton, *Arabic Series: Elementary Arabic; Second Reading Book by Reynold [A. Nicholson*, Arabic Series (London: Cambridge University Press, 1909)

Helminski, Camille Kabir, *Rumi: Daylight: A Daybook of Spiritual Guidance*, (Boston: Shambhala Publications, 1999)

J.L. Esposito, *The Oxford Dictionary of Islam*, Oxford Quick Reference (Oxford University Press, 2004)

Manzoor, Seema, Nasreen Aslam shah, and Asma Manzoor. 2020. "SUFISM AS A GLOBAL HIGHWAY TO PEACE". *Iḥyā'al'ulūm - Journal of Department of Quran O Sunnah* 19 (January). https://doi.org/10.46568/ihya.v19i.24

Najībābādī, Akbar Shāh Khān, *Tārīkh-i Islām*, (Deoband: Maktabah-i-Raḥmat, 1968)

Radhika Kanchana, "How do Muslim States Treat their "Outsiders"? Is Islamic Practice of Naturalisation Synonymous with Jus Sanguinis?," in *Migration and Islamic Ethics: Issues of Residence, Naturalisation and Citizenship*, ed., Ray Jureidini amd Said Fares Hassan (Laiden: Brill, 2002).

Zagorin, Perez. *How the Idea of Religious Toleration Came to the West* (Princeton: Princeton University Press 2003).

Websites:

https://www.almaany.com

https://mazameen.com

https://pantheon.world

https://webspace.ship.edu

https://www.jasarat.com

https://www.trt.net.tr

https://www.urdu.awazthevoice.in/